فردوس بریں
از
عبدالحلیم شرر

پہلا باب

پریوں کا غول

اب تو ۱۲۵۶ھ ہے، مگر اس سے ڈیڑھ سو سال پیشتر سیّاحوں اور خاصّیۃً حاجیوں کے لیے وہ کچی اور اُونچی سڑک نہایت ہی اندیشہ ناک اور پُر خطر تھی جو بحر خزر یسپین کے جنوبی ساحل سے شروع ہوئی ہے اور شہر بابل میں ہو کے شاہنامے کے قدیم دیوستان یعنی ملک ماژندران اور علاقہ رودبار سے گزرتی اور کوہسارِ طالقان کو شمالاً جنوباً قطع کرتی ہوئی شہر قزوین کو نکل گئی ہے۔ مدتوں سے اس سڑک کا یہ حال ہے کہ دن دہاڑے بڑے بڑے قافلے لُٹ جاتے ہیں اور بے گناہوں کی لاشوں کو برف اور سردی مظلومی وقتل و غارت گری کی یادگار بنا کے سالہا سال تک باقی رکھتی ہے۔

اِن دنوں ابتدائے سرما کا زمانہ ہے۔ سالِ گزشتہ کی برف پوری پگھلنے نہیں پائی تھی کہ برف برسنا شروع ہو گئی۔ مگر ابھی جاڑا اتنے درجے کو نہیں پہنچا کہ موسمِ بہار کے نمونے اور فصل کی دلچسپیاں بالکل مٹ گئی ہوں۔ آخری موسم کے دو چار پھول باقی ہیں اور کہیں کہیں اُن کے عاشق و قدردان بلبلِ بدخشاں بھی اپنی ہزار داستانی و نغمہ سنجی کے راگ سُناتے نظر آ جاتے ہیں۔ یہ کوہستانِ عرب کے خشک و بے گیاہ پہاڑوں کی طرح برہنہ اور دُھوپ میں جُھلسے ہوئے نہیں بلکہ ہر طرف سایہ دار درخت اور گھنی جھاڑیوں نے نیچر پرستوں اور قُدرت کے حقیقی قدردانوں کے لیے عُمدہ عُمدہ عشرت کدے اور تنہائی کی خلوت گاہیں بنا رکھی ہیں۔ اور جس جگہ درختوں کے جُھنڈ تھے، وہاں آسمان کے نیلے شامیانے کے نیچے قُدرت نے گھاس کا سبزہ اور مخملی فرش بچھا دیا ہے جس پر بیٹھ کے کوئی شرابِ شیراز کے لُطف اٹھانا چاہے تو یہاں نہرِ رُکنا کے بدلے نہرِ ویرنجان موجود ہے جو شاید ابھی ڈیڑھ صدی بھی نہیں گزری کہ رُودِ سفید سے کاٹ کے پہاڑوں کے اندر ہی اندر مختلف

گھاٹیوں میں گھمائی اور آخر شہر خرم آباد کے قریب بحرِ خزر میں گرائی گئی ہے۔

اِن ہی دلچسپیوں اور قدرت کے ان ہی نظر فریب منظروں نے اس کوہسار کے متعلق طرح طرح کے خیالات پیدا کر دیے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنت ان ہی گھاٹیوں میں ہے اور بعض سمجھتے ہیں کہ قدیم دیوزادوں کو کیومرث و رستم و نریمان کے زورِ بازو نے فنا کر دیا، مگر ان کی یادگار میں بہت سی پریاں آج تک اِن تنہائی کے مقامات میں سکونت پذیر ہیں۔ خوش عقیدہ لوگوں میں سے اکثروں نے ان پریوں کو اُڑتے دیکھا ہے اور بعض سیاحوں کو تو پریوں کے بڑے بڑے ہوش رُبا غول گھاٹیوں سے ناگہاں نکل پڑتے نظر آئے۔ یہ بھی سُنا جاتا ہے کہ جو کوئی یکہ و تنہا اِن پریوں کے غول میں آتا ہے، فوراً مر جاتا ہے۔

مگر پریوں اور قدیم دیووں سے زیادہ ظالم ملاحدہ[۱] اور باطنیہ[۲] لوگ ہیں جو اس علاقے میں آباد اور پھیلے ہوئے ہیں۔ اور جو پُرانے اصول وعقائد کا مسلمان ان کے ہاتھ پڑ جاتا ہے، کسی طرح جاں بر نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جمادی الاوّل، جمادی الآخر اور رجب کے مہینوں میں ان کے مظالم کی دھوم مچ جاتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ علاقہ ہائے ترکستان وغیرہ اور استراخان کے مسلمان جب حج کو جاتے ہیں تو جہازوں پر بحرِ خزر سے پار ہو کے اسی علاقے میں اُترتے اور اسی کوہسار طالقان کو طے کرتے ہوئے ارضِ عراق کو جاتے اور پھر وہاں سے خاکِ پاکِ حجاز کا ارادہ کرتے ہیں۔ اگرچہ یہاں کے مظالم کی ہر جگہ شہرت ہو گئی ہے اور بہت سے لوگوں نے یہ راستہ چھوڑ دیا ہے مگر پھر بھی بعض بے پروا مسلمان اپنی خوش اعتقادی کے جوش میں آ نکلتے ہیں۔ علی الخصوص آمل اور اس کے مضافات کے لیے تو اور کوئی راستہ ہی نہیں۔

یہ سڑک جس کا اُوپر ذکر آیا، بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر ہمارے پیشِ نظر صرف وہی

ہے جہاں یہ سڑک نہر ویرنجان کے کنارے کنارے گزری ہے۔ اس مقام سے علاقۂ رُودبار کے میدان ختم ہو گئے اور کوہستان سخت اور پیچیدہ نشیب و فراز کی ابتدا ہے۔ یہاں سے کچھ آگے بڑھ کے سڑک اور طرف گئی ہے اور نہر کوہِ البرز کے دانتوں میں " چکر کھا کے دشوار گزار اور پیچیدہ گھاٹیوں میں غائب ہو گئی ہے۔ شام کو شائد ہی چند گھڑیاں باقی ہوں گی۔ آفتاب سامنے برف آلود چوٹیوں کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس کی کمزور کرنوں نے جو تھوڑی گرمی پیدا کر دی تھی، مِٹ گئی اور ہوا کے سرد جھونکے جو بلند برفستان سے پھسلتے ہوئے آتے ہیں، انسان کے لیے کپکپا دینے کو کافی ہیں۔

اس جگہ پر اور ایسی حالت میں شمال کی طرف سے دو مسافر سر سے پاؤں تک کپڑوں میں لپٹے اور دو بڑی گٹھڑیوں کی صورت بنائے ہوئے آہستہ آہستہ آ رہے ہیں۔ دونوں اپنے چھوٹے چھوٹے اور تھکے ماندے گدھوں پر سوار ہیں۔ ان کی سست روی اور مجموعی حالت سے خیال ہوتا ہے کہ کسی گاؤں کے قریب کے مُلا یا فقیر ہیں جو امارت اور سپاہیانہ دونوں وضعوں سے جدا کسی دینی غرض اور تقدس کی شان سے اس سفر کو نکلے ہیں۔ مگر نہیں۔ وہ قریب آ گئے اور معلوم ہوا کہ مُلا ہیں نہ مشائخ بلکہ دونوں نوعُمر شریف زادے ہیں، اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں میں ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ ان کے لباس اور وضع سے چاہے نہ ظاہر ہو مگر بُشرے بتاتے ہیں کہ کسی معزز خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور ممکن نہیں کہ کسی نامی اور شریف گھرانے سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ موٹے موٹے اور لمبے چوڑے کملوں کے نیچے جنھیں سر سے پاؤں تک لپیٹ لیا ہے، دونوں شرفائے آمل کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ مرد جو ایک خوبصورت نوجوان ہے، ایک اُونی کفتان پر بڑا پوستین کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ سر پر قدیم لمبی ترکی ٹوپی ہے جو بانس کی تیلیوں سے

ایک مخروطی صورت میں بنا کے بکری کی سیاہ کھال سے مڑھ دی گئی ہے۔ٹوپی پر عمامہ ہے اور اسکے کئی پیچ سر سے نیچے اُتر کے کانوں اور گلے میں لپٹے ہوئے ہیں۔ پاؤں میں موزے اور ایک اُونی پاجامہ ہے۔کمر میں چمڑے کی پیٹی کسی ہے، جس میں خنجر لگا ہے اور تلوار لٹک رہی ہے۔اس نوجوان کے پاس کمان اور تیروں کا ترکش بھی ہے۔مگر اِس عہدِ قدیم کے یہ ضروری اسلحہ گدھے کی زین میں بندھے ہیں اور یہی ایک حربہ ہے جس کے ذریعے سے شکار کر کے یہ دلاور نوجوان اپنے اور اپنی دل رُبا رفیقہء حیات کے لیے قوتِ لایموُت حاصل کرتا ہے۔الغرض ایک گدھے پر تو یہ نوجوان سوار ہے اور دوسرے پر ایک اٹھارہ اُنیس برس کی پری جمال۔موٹے موٹے کپڑے اور بھدّے پوستین اس کے زاہد فریب حُسن کو بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔مگر ایک مہ وش کی شوخ ادائیاں کہیں چھپائے چھپی ہیں! جس قدر چہرہ کھلا ہے، حسن کی شعائیں دے رہا ہے، اور دیکھنے والے کی نظر کو پہلا ہی جلوہ یقین دلا دیتا ہے کہ ایسی نازنین وحسین پھر نظر نہیں آئے گی۔ ہماری آفتِ روزگار مہ جبیں ایک زرد ریشمی پاجامہ پہنے ہے جو اُوپر سے نیچے تک ڈھیلا اور پاؤں کے گٹوّں پر خوش نما چُسّت کے ساتھ بندھا ہے۔ گلے میں دیبائے سرخ کا ایک کرتا ہے اور سر پر نیلی پُھولدار اطلس کی خمار۔ لیکن یہ سب کپڑے ایک پُھولے پُھولے پوستین کے اندر چُھپے ہوئے ہیں۔ جو چیز کہ اس کے عورت ہونے کو عام طور پر ظاہر کر رہی ہے، وہ چھوٹی چھوٹی سیکڑوں چوٹیاں ہیں جو خمار کے نیچے سے نکل کر ایک شانے سے دوسرے شانے تک ساری پیٹھ پر بکھری چلی گئی ہیں اور راستے کے نشیب وفراز یا گدھے کی تیز روی سے بار بار کُھل جاتی ہیں۔

اِس دل رُبا لڑکی کے حسن و جمال کی تصویر دکھانا مشکل ہے۔مگر غالباً یہ چند باتیں مشتاق دلوں میں اور آرزومند نگاہوں کے سامنے اس کے زاہد فریب چہرے کا ایک معمولی ساخاکہ قائم کر

سکیں۔ گول آفتابی چہرہ جیسا کہ عموماً پہاڑی قوموں میں ہوتا ہے، سُتے اور کھنچے ہوئے، سرخی کی جھلک دینے والے گال، بڑی بڑی شرابی آنکھیں، لمبی نوک دار پلکیں، بلند مگر کسی قدر پھیلی ہوئی ناک اور خمدار ہونٹ، باریک اور ذرا پھیلی ہوئی باچھیں، چھوٹے سے سانچے میں ڈھلی ہوئی نوک دار ٹھوڑی، شرمگیں اور معمولی جھکی نظروں کے ساتھ شوخ اور بے چین چشم وابرو اور اس تمام سامان حُسن کے علاوہ تمام اعضاو جوارح کا غیر معمولی تناسُب ہر شخص کو بے تاب و بے قرار کر دینے کے لیے کافی ہے۔

یہ دونوں نوعمر مسافر چاروں طرف کے منظروں کو دیکھتے ہیں اور مقامی دشواریوں کی وجہ سے دل ہی دل میں ڈرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ دن کے آخر ہو جانے کے خیال سے ان کے نازک چہرے جنھوں نے ابھی تک تجربے کی پختگی نہیں حاصل کی، پریشان ہونے لگے ہیں۔ مگر اس پر بھی خموشی کا قُفل نہیں کُھلتا۔ ناگہاں کسی فوری جذبے سے مغلوب ہو کے نازنین نے ٹھنڈی سانس لی اور باریک دلفریب آواز میں پوچھا ''آج کون سا دن ہے''؟

نوجوان: (چپکے ہی چپکے حساب لگا کر) جمعرات۔

لڑکی: (حسرت آمیز لہجے میں) تو ہمیں گھر چھوڑے آج پورے آٹھ دن ہوئے۔ (ذرا تامّل کر کے) خدا جانے کون لوگ کیا کیا باتیں کہتے ہوں گے اور کیسی کیسی رائیں قائم کی جاتی ہوں گی۔

نوجوان: یہی کہتے ہوں گے کہ حج کے شوق نے ہم سے وطن چھڑا دیا۔

لڑکی: (پھر ایک آہِ سرد بھر کے) مجھے الزام بھی دیتے ہوں گے کہ نامحرم کے ساتھ چلی آئی۔

نوجوان: زمُرد (اس لڑکی کا نام ہے) اب میں نامحرم نہیں ہوں۔ دو ہی چار روز میں ہم قزوین پہنچ جائیں گے اور وہاں پہنچتے ہی نکاح ہو جائے گا۔

زمُرد: (پھر ٹھنڈی سانس لے کر) خدا جانے وہاں تک پہنچنا بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں! راستے کی دشواریاں مشہور رہی ہیں۔کوئی خوش نصیب مسافر ہوگا جو پریوں کے ہاتھ سے بچ کے نکل جاتا ہوگا۔اور ان سے بچ بھی جائے تو ملاحدہ کیوں چھوڑنے لگے۔

زمُرد میں اس وقت ایک غیر معمولی تغیّر پیدا ہو گیا ہے۔اِس مقام نے اسے کوئی خاص بات یاد دلا دی ہے جس کی وجہسے وہ چاروں طرف کے منظر کو ہر طرف سے مڑ مڑ کے دیکھ رہی ہے اور بار بار آہِ سرد بھرتی ہے۔

نوجوان نے اس بات کا خیال بھی نہیں کیا اور معمولی لہجے میں کہنے لگا ''ملاحدہ کی طرف سے تو مجھے اطمینان ہے۔اس لیے کہ ان کے نقیب آمل سجتہ اللہ سے مجھے ایک خط مل گیا ہے۔وہ ہمیں ایک مجرّب تعویذ کا کام دے گا۔اور اس کے نذر کرتے ہی ہم قرمطی کے دستِ ستم سے نجات پائیں گے''۔

یہ باتیں کرتے وقت دونوں نوعُمر مسافر اس مقام پر پہنچے جہاں سے سڑک تو کہسار کی بلندی پر چڑھنا شروع ہوتی ہے اور نہر اس سے جدا ہو کے دشوار گزار گھاٹیوں اور گھنی خاردار جھاڑیوں میں گھسنے کے لیے داہنی طرف مڑ گئی ہے۔نوجوان نے اپنے گدھے کو سڑک پر آگے بڑھایا ہی تھا کہ زمُرد باگ روک کے کھڑی ہو گئی اور کہا ''نہیں حسین'' (یہ اس نوجوان کا نام ہے)۔

حُسین: (حیرت سے زمُرد کی طرف دیکھ کر) پھر کدھر؟

زمُرد: جدھر نہر بہ رہی ہے۔

حسین: اُدھر تو راستہ نہیں۔

زمُرد: تم چلو تو سہی۔

حسین: آخر تم قزوین چلتی ہو یا کہ کہیں اور؟

زمُرد: نہیں۔ میری منزل مقصود قزوین نہیں۔ مجھے تو دیکھنا ہے کہ نہر کدھر گئی ہے۔

حسین: اُس طرف تو پریوں کا نشیمن ہے۔

زمُرد: ہونے دو۔

حسین: سنتا ہوں کوئی اُدھر سے زندہ نہیں جاتا۔

زمُرد: یہی میں بھی چاہتی ہوں۔

حُسین نے تعّجب اور حیرت سے زمرد کی صورت دیکھی اور ایک متانت کی آواز سے کہا" اور وہ حج کی نیّت کیا ہوئی؟

زمُرد: ہے، مگر اپنے بھائی موسیٰ کی قبر پر جا کے فاتحہ پڑھ لوں تو مکہ معظّمہ کا ارادہ کریں۔

حسین: تمھارے بھائی کی قبر! مگر یہ کیسے خبر کہ کہاں ہے؟

زمُرد: مجھے معلوم ہے- راستہ بھی جانتی ہوں اور اُس مقام کو بھی۔

حسین: (حیرت سے) تم؟ تم کیا جانو؟

زمُرّد: خوب جانتی ہوں۔

حسین: کیا کبھی آئی تھیں؟

زمُرد: نہیں۔ مگر یعقوب جو بھائی موسیٰ کے مرنے کی خبر لایا تھا، اُس سے پُورا پتا دریافت کر چکی ہوں۔ پہلی نشانی تو یہ ہے کہ جہاں سے نہر سڑک سے علیحدہ ہوئی ہے، سڑک چھوڑ کے نہر

کے کنارے جانا چاہیے۔اور بعد کی نشانیاں آگے چل کر بتاؤں گی۔

حسین: یعقوب کو کیا معلوم؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ان بلند اور پیچ در پیچ پہاڑوں میں کون شخص کہاں اور کیوں کر مارا گیا؟

زمرد: تم نہیں جانتے، بھائی موسیٰ اور یعقوب دونوں ساتھ تھے۔اس مقام پر پہنچ کر نہر کے کنارے کنارے کچھ دور گئے تھے کہ کوہِ البرز سے پریوں کا غول اُترا۔ان کے ہاتھ سے بھائی تو مارے گئے اور یعقوب غش کھا کے گر پڑا۔دوسرے دن جب اُسے ہوش آیا تو بھائی کی لاش پڑی پائی۔انہیں دفن کیا۔پھر قبر بنا کے اور قبر کے پاس ہی ایک چٹان پر ان کا نام کندہ کر کے واپس آیا۔

حسین: مجھے تو غپ معلوم ہوتی ہے۔آخر اس کا سبب کہ پریوں نے یعقوب کو تو زندہ چھوڑ دیا اور تمھارے بھائی مارے گئے؟

زمرد: اس کا یہ سبب ہوا کہ بھائی نے ایک پری کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔اور یعقوب بُزدل تھا۔ پری زادوں کو دیکھتے ہی غش کھا کے گر پڑا۔

حسین: پھر ایسے مقام میں تو ہرگز نہ جانا چاہیے۔

زمرد: نہیں حسین۔میں ضرور جاؤں گی۔

حسین: فرض کرو کہ ہم وہاں پہنچتے اور ہمارے سامنے پریاں اُتریں تو؟

زمرد: میں تو اس سے نہیں ڈرتی۔اگر تمھیں خوف ہے تو نہ چلو۔

حسین: تم اکیلی جاؤ اور میں نہ چلوں؟ میں جو تمھاری محبت میں ہر وقت جان دینے کو تیار ہوں۔

زمُرّد: حسین، سنو۔ میں تمھارے ساتھ نہ آتی۔ مانتی ہوں کہ تم شریف ہو اور اُس زمانے سے جب کہ ہم دونوں مکتب میں ایک ساتھ پڑھتے تھے، مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ ایک شریف لڑکی کو تم فقرہ دے کے نکال لائے ہو۔ میں خود شوق سے آئی ہوں۔ فقط اتنی اُمید پر کہ بھائی کی قبر پر کھڑے ہو کے دو آنسو بہاؤں گی۔ جب یہ مقصد پورا ہو لے گا تو حج کو چلونگی۔

حُسین: زمرد، اپنی جوانی اور اس کم سنی پر ترس کھاؤ اور اس ارادے سے باز آؤ۔

زمُرّد: نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی آرزو کے لیے بے عزتی گوارا کی ہے۔

حُسین: (مایوسی کی آواز سے) خداوندا! اگر جان ہی جانی ہے تو میں مارا جاؤں۔

زمُرّد: تیری مصیبت ان آنکھوں سے نہ دیکھی جائے گی (مسکرا کے) گھبراؤ نہیں۔ ہم دونوں کی کشش ایک دوسرے کو کھینچ لے گی۔ مارے گئے تو دونوں مارے جائیں گے۔ یہ کہہ کر زمُرّد نے اپنے گدھے کو نہر ویرنجان کی طرف موڑا۔ دو ہی قدم چلی ہو گی کہ حسین نے روک کر کہا ''زمُرّد، ذرا صبر کرو۔ چلنا ہے تو کل چلنا۔ اب شام ہوا چاہتی ہے۔ پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔''

زمُرّد: بس اب چلے ہی چلو۔ کہیں آبادی ملنے کی تو اُمید نہیں اور جب جنگل ہی میں ٹھہرنا ہے تو یہاں وہاں دونوں جگہ برابر ہے۔ حسین سے کسی طرح انکار کرتے نہ بنی، چل کھڑا ہوا اور دل میں پس و پیش کرتا ہوا زمُرّد کے ساتھ کوہِ البرز کی تیرہ و تار گھاٹی میں گُھسا۔ اب دونوں آہستہ آہستہ چلے جاتے ہیں، اور اِس سنسان مقام کا رعب دونوں پر اس قدر بیٹھ گیا ہے کہ بالکل خاموش ہیں۔ جوں جوں آگے بڑھتے ہیں، جنگل گھنا ہوتا جاتا ہے۔ سردی ساعت بساعت بڑھ رہی ہے۔ سنّاٹے نے نہر کے بہنے کی آواز زیادہ تیز کر دی ہے جس سے اس مقام کے وحشت ناک منظر میں ایک ہیبت پیدا ہو گئی ہے۔ اب راستہ دشوار ہے۔ گدھوں سے اُترنا پڑا۔ دونوں آگے پیچھے اپنے

گدھے کے دہانے ہاتھ میں پکڑے چٹانوں سے نیچے اور جھاڑیوں میں گھستے چلے جاتے ہیں۔

آخر دیر کے سکوت کے بعد حسین نے مرعوب ہو کر کہا: ''بے شک پریاں ایسے ہی سناٹے کے مقام میں رہتی ہیں۔ انسان کیا معنی، یہاں جانور کا بھی پتا نہیں۔

زُمّرد: ہاں۔ اور سنتی ہوں کہ اس نہر میں اکثر جگہ پریاں نہاتی ہیں اور بال کھولے ہوئے آپس میں کھیلتی اور چھینٹیں اُڑاتی بھی نظر آ جایا کرتی ہیں۔

حُسین: (چونک کر) یہ سنسناتی آواز کیسی تھی؟ جیسے کوئی چیز سن سے کانوں کے پاس سے آ گے نکل گئی۔

زُمّرد: اور یہ مشہور بات ہے کہ پریوں کے تخت چاہے اڑتے نظر نہ آئیں، مگر ان کے نکل جانے کی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔

حُسین: یہ بھی ممکن ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی جانور تھا۔

زُمّرد: جانور ہوتا تو دکھائی نہ دیتا؟

حُسین: اگر چہ ابھی آفتاب غُروب نہیں ہوا، مگر یہاں تم دیکھ رہی ہو کہ شام سے بھی زیادہ اندھیرا ہے۔ ایسے دھندلکے میں بعض اوقات اُلو یا بڑے بڑے چمگادڑ بھی اسی طرح سّناٹے کی آواز سے اُڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

زُمّرد: لیکن اصل میں یہ بھی وہی پری زاد ہیں جو مختلف جانوروں کی صورت میں رات کو نکلتے ہیں۔

حُسین: ہو گا۔ (اتنا کہہ کے اس نے اِرد گرد کے سین کو وحشت اور بزدلی کی نگاہوں سے دیکھا، اور نہایت پریشانی کی آواز میں کہا) شام ہوا چاہتی ہے اور تمھارے بھائی کی قبر کا کہیں پتا

نہیں۔

زمُرد: مگر میں تو بھائی کی قبر تک پہنچے بغیر دم نہ لوں گی۔

یہ کہتے ہی ایک نہایت تاریک گھاٹی نظر آئی جس میں نہر تو گئی ہے مگر دونوں جانب ایسی چکنی اور کڑی چٹانیں ہیں کہ انسان کا گزرنا بہت دشوار ہے۔ اس گھاٹی کی صورت دیکھتے ہی زمُرد ایک شوق اور بے خودی کی آواز میں چلّا اُٹھی ''ہاں، دیکھو! یہ دوسری علامت ہے۔ اسی میں سے ہو کے راستہ گیا ہے''۔

حسین: مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ ادھر سے ہم جائیں گے کیونکر؟

زمُرد: جس طرح بنے، جاؤں گی ضرور۔

حسین: اور یہ گدھے؟

زمُرد: اِن کو یہیں چھوڑ دو۔ واپس آ کے لے لینا۔

حسین نے اِس مستقل مزاجی پر زمُرد کو تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ پھر گدھے درختوں سے باندھے اور دونوں چٹانوں سے چمٹتے اور ہاتھوں سے پتّھروں کے سروں کو پکڑتے ہوئے آگے روانہ ہوئے۔ کوئی دو گھڑی یہ محنت کا سفر کیا ہو گا کہ گھاٹی ختم ہو گئی جس سے نکلتے ہی دونوں نے حیرت سے دیکھا کہ نہر ویرنجان اس گھاٹی سے گزر کے یکا یک ایک نہایت ہی فرح بخش مَرغ زار میں بہنے لگی ہے۔ عجب لطف کا مقام تھا۔ قدرت نے خود ہی چمن بندی کر دی تھی۔ شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کے تختے دور دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ نغمہ سنج طیور بھی یہاں کثرت سے نظر آئے، جو ہر طرف شاہدانِ چمن کے حسن و جمال پر صدقے ہوتے پھرتے تھے۔ شام ہو رہی تھی، اور یہ جوش میں بھرے ہوئے عاشقان شاہدِ گل اپنے معشوقوں کو آخری الوداع کہہ رہے تھے۔ یہ سماں دیکھتے ہی

زمّرد نے خوش ہو کے کہا ''اب ہم اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ گئے۔ اس وادی میں بھائی موسیٰ مارے گئے اور یہیں کہیں اُن کی قبر بھی ہوگی''۔ یہ کہہ کے زمّرد ایک نازک بدن اور چست چالاک ہرنی کی طرح چاروں طرف دوڑی اور ایک بڑے پتھر کے پاس ٹھہر کے چلّائی ''آہ! یہی میرے بھائی کی قبر ہے''۔

اس آواز کے سنتے ہی حسین اُدھر دوڑا گیا اور دیکھا کہ ایک چٹان پر موسیٰ نام کُھدا ہوا ہے اور اس کے قریب ہی چند پتھروں کو برابر کر کے ایک قبر کی صورت بنا دی گئی ہے۔ دونوں نے یہاں کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کی۔ مگر زمُرد کے دل پر حسرت و اندوہ کا اس قدر غلبہ ہوا کہ دُعا ختم ہونے سے پہلے ہی وہ گر پڑی اور قبر سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ حسین نے بہت کچھ تسلّی دی، نہر سے پانی لا کے منہ دُھلایا اور رات کے اندھیرے میں اپنی خوش رَوِش معشوقہ کو اپنی گود میں لے کے بیٹھا اور سمجھانے لگا۔

زمُرد: (ہچکیاں لے لے کے) حسین مجھے اپنی زندگی کی اُمید نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہیں مروں گی۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے ہیں۔ کلیجے میں میٹھا میٹھا درد ہے اور دل بیٹھا جاتا ہے۔ مگر مرنے سے پہلے تم سے ایک وصیت ہے۔ میں مر جاؤں تو میری لاش کو بھی اِنھی پتّھروں کے نیچے جہاں بھائی موسیٰ کی ہڈیاں ہیں، دبا دینا۔

حُسین: (نہایت مستقل مزاجی سے، آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسو پی کر) یہ وصیت اگر پُوری ہونے والی ہوگی تو کسی اور کے ہاتھ پر پوری ہوگی۔ میں تمھارے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور جس کے ہاتھ سے یہ وصیت پوری ہوگی وہ تمھارے ساتھ میری ہڈیوں کو بھی اِنھی پتّھروں کے نیچے دبائے گا۔

زمُرد : (خوشامد کے لہجے میں) نہیں حسین۔ ایسا نہ کرنا۔ تم کو ابھی نہیں معلوم کہ مجھے کیا چیز یہاں کھینچ لائی۔ نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ بھائی کی محبت نے اور نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ یعقوب کے بیان میں کوئی جادو تھا۔ مگر جس روز اس نے بھائی موسیٰ کی حسرت نصیب داستاں سنائی، اس کے دوسرے ہی دن میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے بھائی اس وادی میں کھڑے ہیں۔ خواب ہی میں انھوں نے مجھے ہاتھ کے اِشارے سے اپنی طرف بلایا اور تاکید کر کے کہا کہ میری قبر پر آ کے فاتحہ پڑھ۔ مرحوم بھائی نے کچھ ایسی مؤثر وضع سے بلایا تھا کہ اُن کی اُس وقت کی صورت اِس وقت تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ اِس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ میں یہاں بھائی کی بُلائی ہوئی آئی ہوں۔

حُسین: (وفورِ گریہ سے بے اختیار ہو کے اور بے انتہا جوش کے ساتھ) خیر۔ تمھیں تو انھوں نے خواب میں بلایا ہے اور تم مجھے خود اپنے ساتھ لائی ہو۔

زمُرد: ہاں۔ مَیں تم کو ساتھ لائی ہوں، اور اسی سبب سے کہ اس دنیا میں مجھے تم سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ اور میری تمنا ہے کہ تمھارے پہلو میں تمھاری آنکھوں کے سامنے جان دوں۔ اس کے بعد تم گھر جاؤ اور وہاں عزیزوں اور شہر کے دیگر شُرفا کے نزدیک میری جو بے عزتی ہوئی ہے، اُس کو دور کرو، اور میری خبرِ مرگ کے ساتھ جا کے بتاؤ کہ میں نے کیوں اور کہاں جان دی اور مرتے وقت تک ایسی ہی پاک دامن تھی۔ (گلے میں باہیں ڈال کے)

حسین! میری آرزو ہے کہ تم زندہ رہو اور میرے دامن سے بدنامی کا دھبّا دھوؤ۔

ناگہاں ایک پہاڑی کی ڈھالو سطح پر کچھ روشنی نظر آئی جس پر پہلے زمّرد کی نظر پڑی اور اُس نے چونک کے کہا ''یہ روشنی کیسی''؟ حسین نے بھی اس روشنی کو حیرت سے دیکھا اور کہا۔ ''خدا جانے کیا

بات ہے! اور دیکھو، اِدھر بڑھتی چلی آتی ہے۔ اس رات کی تاریکی میں یہاں آنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں!

دونوں عاشق و معشوق روشنی کو گھبرا گھبرا کے ساعت بہ ساعت زیادہ متحرک ہوتے دیکھ رہے تھے کہ وہ بالکل قریب آ گئی۔ بڑی بڑی پندرہ بیس مشعلیں تھیں اور ان کے نیچے حسین و پری جمال عورتوں کا ایک بڑا غول، جن کی صورت دیکھتے ہی زمّرد اور حسین دونوں نے چیخ ماری۔ دہشت زدگی کی آواز میں دونوں کی زبان سے نکلا ''پریاں''!

اور دونوں غش کھا کر بے ہوش ہو گئے۔

۱۔ مُلحد کی جمع۔ بے دین لوگ۔ مُراد باطنیہ فرقے کے لوگ۔

۲۔ مسلمانوں کے بعض فرقے جو خلافتِ عباسیہ کے دور میں نمودار ہوئے۔ ان کی نوعیت سیاسی تھی لیکن انھوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ ان میں ایک فرقہ اسماعیلیہ تھا جس کے رہنما حسن بن صباح نے اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنے کے لیے ۱۰۹۰ء میں ایک دہشت پسند جماعت بنائی اور کوہ البرز (ایران) کے قلعہ الموت کو اپنا گڑھ بنا کر اسلامی ملکوں میں اپنے فدائیوں کے ذریعے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔

دوسرا باب

پیاری زُمّرد ---تُو کہاں گئی!

بہ مے سجّادہ رنگیں کن گرت پیرِ مُغاں گوید

صبح کا وقت تھا اور نسیم کے جھونکے چل رہے تھے کہ مرغانِ سحر نے اپنے اپنے نشیمنوں سے نکل نکل کے حسین کو خوابِ بے ہوشی سے جگایا۔ خمار کی سی کروٹیں بدل کے آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا اور چاروں طرف مُڑ مُڑ کے دیکھا مگر زمّرد کا کہیں پتا نہ تھا۔ جب معشوقۂ دلرُبا کی محبت بھری صورت کسی طرف نظر نہ آئی تو کلیجا دھک سے ہو گیا۔ ناتوانی اور سر پھرنے کی وجہ سے کئی دفعہ گر گر اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا چلا، آس پاس ہر جگہ دیکھا، ہر طرف نظر دوڑا دوڑا کر ڈھونڈا لیکن نازنین و ناز آفرین زمّرد کا نام ونشان نہیں۔ آخر ہر طرف سے مایوس ہو کے اور جستجو میں تھک کے موسیٰ کی قبر کے پاس آکے بیٹھ گیا اور نہایت ہی حسرت و اندوہ کے عالم میں آنسو بہا بہا کے کہنے لگا:

''پیاری زمّرد! تُو کہاں گئی؟ آہ! آسمان و زمین کھا گئے یا رات کی پریاں تجھے بھی اپنے ساتھ لے گئیں''؟ اتفاق سے موسیٰ کی قبر پہ نظر پڑی اور دیکھ کے متعجب ہوا کہ قبر کچھ بدلی ہوئی سی ہے اور دو ایک پتّھر زیادہ ہیں جو شام تک نہ تھے۔ حیرت کم نہ ہوئی تھی کہ اس چٹان پر نظر گئی جس پر موسیٰ کا نام کھدُا ہوا تھا۔ اور اس کتبے میں بھی کچھ تغیّر دیکھ کے غور سے پڑھنے لگا۔ کسی قدر بلند آواز میں اس کی زبان سے نکلا ''موسیٰ اور زمرد'' اور اس کے ساتھ ہی چیخ مار کر پھر بے ہوش ہو گیا۔ غم و اندوہ کے فوری جھٹکے پر طبیعت پھر غالب آئی، ہوش آیا اور دل میں کہا ''افسوس! وہی ہوا جو زمّرد کہتی تھی۔ وہ مر گئی اور میں زندہ ہوں۔ آہ! پریاں شرحِ الم تھیں۔ پھرتی سے اسے مار ڈالا۔ مجھے نیم جان چھوڑ گئیں۔ آہ! وہ میری جان تھی۔ پھر اس کے بغیر کیوں زندہ ہوں''۔ یہ کہہ کر اسی چٹان سے سر

ٹکرانے لگا جس پر دونوں بہن بھائی کے نام کندہ تھے۔دل میں آئی کہ قبر کھول کے اپنے آپ کو بھی اُس میں دفن کر دے، بلکہ اس ارادے سے چلا تھا کہ مذہب کے فرشتے نے کان میں کہا ''یہ دین کے خلاف اور مرنے والوں کی توہین ہے''۔فرشتۂ غیب کی آواز سُنتے ہی اس نے زور سے چلّا کے کہا ''تُو پھر میں کیا کروں''؟ یہ کہہ کر زمین پر گر پڑا، اور تڑپنے لگا۔دیر تک تڑپنے اور نالہ وزاری کرنے کے بعد اُٹھا اور دوڑ کر موسیٰ کی قبر سے لپٹ گیا۔اب وہ اسے زمّرد کی قبر سمجھتا تھا اور جس طرح کوئی زندہ شخص کسی طرف متوجہ ہو کے باتیں کرتا ہے، اسی طرح اس قبر کی طرف خطاب کر کے کہنے لگا:

''پیاری زمّرد، مرنا اپنے اختیار میں نہیں، خودکشی حرام ہے اور جینا بے سود بے مزہ۔لیکن کب تک؟ مرنا برحق ہے اور موت ایک دفعہ ضرور آئے گی۔پھر اس کا انتظار اسی جگہ کیوں نہ کروں۔زندگی ان باقی دنوں میں تیری قبر میری مونس وجلیس ہوگی اور تیرا خیال میرا باوفا معشوق۔بس اب میں یہیں رہوں گا اور یہیں مروں گا۔ہائے! جس طرح تیرے بھائی نے تجھے اپنے پاس بُلا لیا، اسی طرح تُو مجھے بُلا لے۔تیری وصیت مجھ سے پوری نہیں ہو سکتی۔اب میں یہیں کا ہوں۔کیا عجب کہ پریوں کا پھر کبھی اِدھر گزر ہو۔وہ آسانی سے مجھے تیرے پاس پہنچا دیں گی۔''

دل میں یہ فیصلہ کر لینے کے بعد حسین کو کسی قدر تسکین سی ہو گئی۔قبر پر سے اُٹھ کے نہر کے کنارے گیا، پُرنم آنکھوں پر پاک وصاف پانی کے چھینٹے دیے، وضو کیا اور قبر کے برابر کھڑے ہو کر چند نفل رکعتیں ادا کیں۔پھر بیٹھ کر انتہائی خضوع کے ساتھ زمرد کے لیے دعائے مغفرت کرنے لگا اور ہمیشہ کے لیے یہیں سکونت اختیار کر لی۔

حسین نے کچھ ایسے مضبوط دل سے اپنے لیے یہ زندگی اختیار کی تھی، اور موت کی دعا مانگنے یا جاں

ستاں پریوں کے انتظار میں اسے کچھ ایسا مزہ ملنے لگا تھا کہ اب اسے نہ وطن یاد رہا نہ وہ ارادۂ حج۔ زمرد کا خیال اس کا قبلہ اور مشترک قبر اس کی مسجد۔ گھاس پات اور کبھی کبھی چڑیوں کے شکار پر بسر ہوتی ہے اور پیامِ مرگ کا ہر گھڑی انتظار رہتا ہے۔ جب کبھی اندوہ وغم کا زیادہ ہجوم ہوتا ہے تو اپنی نازنین معشوقہ کی قبر سے لپٹ کے اور روروکے دل کی بھڑاس نکال ڈالتا ہے۔

اِسی حالت میں رہتے اور موسیٰ اور زمرد کی تُربت کا مجاور بنے اسے چھ مہینے گُذر گئے۔ جاڑوں کا پُورا موسم انھی پہاڑوں پر بسر ہوا، جہاں ایک عرصے تک ان مظلوم شہیدانِ حسرت کی قبر پر برف کی چادر چڑھی رہی۔ موسم کی سخت سردی اور برف باری اس نے صبر وشکر کے ساتھ جھیل لی۔ اب بہار کا زمانہ ہے اور ہر طرف پہاڑوں کی پہلو نشین وادیاں، اور یہ سارا مرغزار پھولوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہوا کے جھونکے ہمیشہ معطر ومشکبار رہتے ہیں اور دل کا ولولہ ساعت بساعت زیادہ بڑھتا جاتا ہے۔ حسین کا غم اب پہلے سے زیادہ جوش وخروش پر ہے اور ان ظالم پری وشوں کے انتظار میں بے صبری اور بے چینی پیدا ہو چلی ہے۔ روز روروکے کہتا ہے "افسوس! موسیٰ اور زمّرد کا کام تو پریوں نے ایک ہی دن میں تمام کر دیا اور میں ایسا بدنصیب ہوں کہ انتظار ہی انتظار میں چھ مہینے گزر گئے اور وہ گویا اِدھر کا راستہ ہی بھُول گئیں۔"

ایک دن وہ صبح کو سو کے اُٹھا تو خلافِ معمول زمرد کی قبر پر ایک کاغذ پڑا ملا۔ حیرت وشوق سے دوڑ کے اُسے اٹھالیا اور پڑھا تو چند لمحے تک نقشِ حیرت بنا کھڑا رہا۔ بار بار تحریر کو غور کر کے دیکھتا اور کہتا "کہیں نگاہ غلطی تو نہیں کر رہی ہے؟" مگر ساعت بساعت یقین ہوتا جاتا کہ خاص زمّرد کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ اِس خط کی عبارت یہ تھی:

حُسین! میں اس عالم میں نہایت ہی خوش ہوں۔ یہاں کی مسرت تیرے وہم وقیاس سے باہر ہے۔

میں اسی باغ میں ہوں جس کا قرآن اور تمام کتبِ سماویہ میں ہر مسلمان اور خدا شناس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ سب لذّتیں مجھے خدا کی مہربانی سے حاصل ہیں۔ زہرہ ومشتری جن کی شعاعیں تجھے دور سے نظر آتی ہیں، میری انیس وجلیس ہیں۔ ان کا قصّہ تو نے سنا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ اس عالمِ نور اور اس مرکزِ لاہُوت کی مسّرتیں کتنی دلفریب ہیں کہ انھیں ہارُوت وماروت کی جانبازی کا خیال بھی نہیں آتا۔ مگر میں یہاں بھی تیرے لیے حیران اور تجھ سے ملنے کی مُشتاق ہوں۔ فرشتوں اور دیگر روحوں کے ذریعے سے مجھے برابر معلوم ہوتا رہا کہ تو میری قبر کا مجاور بنا بیٹھا ہے۔ وہ مادّی کشش جو ایک عرصے تک روح کو عالمِ عناصر کی طرف متّوجہ رکھتی ہے، مجھے بار ہا میری قبر پر لے گئی۔ میں نے تجھے اپنی قبر سے لپٹ کے روتے دیکھا اور خود بھی تیرے ساتھ گھنٹوں کھڑی رویا کی۔ مگر افسوس! نہ تیری دنیاوی آنکھیں میری صورت دیکھ سکتی تھیں اور نہ تیرے مادی کان میرے رونے کی آواز سن سکتے تھے۔ تو ناحق موت کا منتظر ہے۔ ابھی تجھے بہت دنوں دنیا میں رہنا ہے۔ وہ وقت دور ہے جب کہ مجھے تیرے وصال کی خوشی حاصل ہوگی۔ وہ باغ جہاں تُو ہے، پریوں کا نشیمن ہے، مگر تیرے سبب سے وہ وہاں نہیں آسکتیں۔ اور چونکہ ابھی تیرے مرنے کا وقت نہیں آیا، لہذا تجھے قتل بھی نہیں کرسکتیں۔ یہ اسباب ہیں جن کی وجہسے وہ کسی طرح اپنی تفریح گاہ کو تجھ سے خالی نہیں کرا سکتیں۔ مجبوراً خود انھی کو اپنا نشیمن چھوڑ دینا پڑا۔ افسوس! تو نے میری وصیت پر عمل نہ کیا۔ بد نام کرنے والے اور میرے نام پر تہمت لگانے والے اسی طرح ذلیل کررہے ہیں۔ ان کے افترا اور طُور مار مجھے بہت ستاتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں تجھے پھر اپنی وصیت یاد دلاتی ہوں اور نہایت ہی آرزو کے ساتھ کہتی ہوں کہ جا اور میری وصیت پوری کر۔ تجھ سے دور اور تیری دلدادہ زمُرّد

حسین نے ہزار ہا دفعہ اس خط کو پڑھا۔ اس کی طرزِ تحریر، خط اور الفاظ کو غور سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ

کے دیکھا۔ کسی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا مضمون ہے۔ ایک دفعہ گھبرا کے بولا'' کیا زمّرد زندہ ہے''؟ پھر آپ ہی کہنے لگا'' نہیں، ممکن نہیں۔ وہ خود ہی لکھ رہی ہے کہ دوسرے عالم میں ہے اور فردوسِ بریں کی سیر کر رہی ہے۔ پھر یہ خط کیوں کر آیا اور کون لایا''؟ دیر تک غور کرتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پہلے دل میں آئی کہ زمّرد کی ہدایت کے موجب گھر واپس چلا جائے مگر پھر آپ ہی بولا'' نہیں، بالکل بے حاصل ہو گا۔ اوّل تو وہاں تک جایا کس سے جائے گا اور بالفرض جاؤں بھی تو اس قصّے پر یقین کسے آئے گا۔ سب مجھے جُھٹلا کر بے وقوف بنائیں گے۔ میں نہیں جا سکتا۔ اب تو عہد کر چکا ہوں کہ زندگی کی سب باقی ماندہ دن اسی قبر اور زمّرد کی یادگار کے پاس بسر کروں گا۔ زمّرد کہتی ہے کہ مجھے ابھی بہت دنوں ایڑیاں رگڑنا ہے۔ بہتر ہے۔ رگڑوں گا اور جہاں تک جھیلا جائے گا جھیلوں گا۔ اس جگہ ایڑیاں رگڑنا بھی زمانے کی خاک چھاننے سے اچھا ہے۔ افسوس! زمّرد دل میں خفا ہو گئی کہ اب بھی میری وصیت پوری نہ کی۔ لیکن میں عُذرات پیش کیے دیتا ہوں۔ جو فرشتے میری روز روز کی خبر اُس تک پہنچاتے ہیں، میرا عُذر بھی گوش گزار کر دیں گے۔ یہ ممکن ہے کہ اس وقت وہ کھڑی مجھے دیکھ رہی ہو۔ میری باتیں اپنی کانوں سے سن رہی ہو۔ ممکن ہے کیا معنی، بالکل قرین قیاس ہے۔ اب اپنے خط کا جواب سُننے کے لیے اس کی روح اس وقت یہاں ضرور آئی ہو گی۔ ہاں، تو جو کچھ کہنا ہے، اسی سے کہوں۔''

یہ خیال اس کے دل پر جم گیا اور زمّرد کی قبر کی طرف دیکھ دیکھ کے یوں کہنا شروع کیا ''پیاری زمّرد! نہ میں اس قبرِ پُرنُور میں ہوں جہاں تُو ہے اور نہ میرے پاس وہ نورانی نامہ بَر ہیں جو مجھ خاکی پیکر کا خط تیرے پاس پہنچا دیں۔ اپنی نورانی اور نوری توجہ سے کام لے اور خود میری زبان سے عُذر سُن۔ حورِ وَش اور مقبولِ الٰہی نازنین! اور غواصِ دریائے رموزِ وحدت اور کثرت! کیا عجب کہ اپنے

نور اور تحیر کی آنکھوں سے تو میری اس وقت ستم زدگی کا تماشا دیکھ رہی ہو یا یہ میری آہ وزاری کی جگر دوز آواز تیرے روحانی کانوں تک پہنچ رہی ہو۔زمّرد! مجھے ان لوگوں کے پاس نا بھیج جن کے فہم وادراک سے تیری رُوحانیت اور تیری مقبولیت ومعصومیت کا قصہ بالاتر ہے۔وہ میرے کہنے کا یقین نہ مانیں گے۔لہٰذا اپنے عشق میں مجھے اس ذلّت ورسوائی سے بچا اور اگر بارگاہِ لم یزل میں تیری آواز کچھ بھی اثر رکھتی ہو تو مجھے کوشش کر کے اپنے پاس بُلا لے اور اُن پریوں کو جلدی بھیج کہ وہ اپنی تفرتح گاہ کو مجھ سے خالی کرالیں میری روح تیرے شوق میں ذبح کیے ہوئے ایک طائر کی طرح تڑپ رہی ہے اور اس ناری پنجرے سے نکلنے کے لیے پھڑکتی ہے۔محبت والی نازنین! مجھے اور کہیں نہ بھیج بلکہ اپنے پاس بُلا۔''

اس قسم کے خیالات ظاہر کرتے کرتے حسین کا جوش اس قدر بڑھ گیا کہ بے تاب ہو کے زمین پر گرا اور لوٹنے اور تڑپنے لگا۔اور جب جب ناتوانی زیادہ ہوئی تو قبر سے لپٹ کے بے ہوش ہو گیا۔اب اُس خط نے اس کا جوش بڑھا دیا تھا اور اُس کے دن پہلے سے زیادہ غم واندوہ میں گزر رہے تھے۔ زمّرد نے عالمِ پرستان سے جو مُراسلت کی تھی، اُس نے دل کے جذبات کو یکا یک اُبھار دیا۔روز جنت نشین معشوق کو خواب میں دیکھتا اور روز ایک نیا خیال پیدا ہوتا۔شاید عالمِ آخرت کا اتنا علم و یقین کسی مسلمان کو کم ہوگا جتنا کہ فی الحال حسین کو تھا۔دنیا اس کی نظر میں ہیچ تھی۔وہ اپنے آپ کو عالمِ نور وظلمت کے مابین ایک برزخ میں پاتا اور بے خبری اور خود فراموشی کے ساتھ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس مادی اور جسمانی جامے کو چاک کر کے عالمِ نور میں جا پہنچے۔اس حالت کو بھی ایک مہینہ ہو گیا، جس کی ہر گھڑی زمرد کے کسی نئے خط کے انتظار میں گزر رہی تھی۔آخر انتظار کا زمانہ ختم ہو گیا اور ایک خط ملا جس کا مضمون یہ تھا: ''اے محبوسِ ظلمت کدۂ ارض! میری جستجو میں تو حد سے گزرا جاتا

ہے اور یہ نہ سمجھ کہ مُجھ پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ میرے تعلقات تیرے ساتھ وابستہ ہیں اور یہی سبب ہے کہ اس عالم میں بھی جہاں ہر طرف سے مسّرتیں ہجوم کیے ہوئے ہیں اور خداوندِ جّل وعّلا نے ایک خاص بعید از فہم و ادراک لذّت میرے دل میں پیدا کر دی ہے، میں تیری طرف سے اپنا خیال نہیں ہٹا سکتی۔ تیری یاد میں یہ روحانی لذتیں بھی میرے دل سے کانٹا نہیں نکال سکتیں۔

"خیر اب تُو نے پورا امتحان دیا ہے اور کوئی چیز تیرے دل سے میرا خیال نہیں نکال سکتی، تو مایوس نہ ہو اور مجھ سے ملنے کا سامان کر۔ یاد رکھ! یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں تو مجھے پا سکے گا۔ میں تجھ سے قریب بھی ہوں اور دُور بھی ہوں۔ لیکن جس دروازے سے تُو میرے پاس آ سکے گا وہ بہت فاصلے پر ہے اور وہاں تک تو بڑی محنت و ریاضت سے پہنچ سکے گا۔ اِس کام کے لیے تجھے نفس کُشی اور ریاضت بھی کرنا ہوگی اور بڑے بڑے سفر بھی کرنا پڑیں گے۔ اس طرح بے مُرشد و رہبر پہاڑوں سے ٹکرانا بے سُود ہے اور نہ اس رونے دھونے سے کچھ اثر ہوگا۔ اگر مجھ سے ملنے کا شوق رکھتا ہے تو اس وادی سے نکل اور کوہِ جودی کی مغربی پہاڑیوں میں جا۔ وہاں ایک بڑا غار ہے جس میں بڑے بڑے خدا شناس لوگ چلّہ کشی کر چکے ہیں۔ لوگ نہیں جانتے مگر مجھے یہاں آ کے معلوم ہوا کہ جس غار میں جنابِ ابراہیم علیہ السّلام نے کواکب کے طلوع و غرُوب سے فسخِ عزائم کر کے خدا کو پہچانا تھا، وہ یہی غار ہے۔ اب لوگ اس غار کو ارضِ شام میں بتاتے ہیں۔ لیکن یہ صریح جھوٹ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا بچپن شام میں نہیں گزرا بلکہ اس سرزمین میں جہاں اُن کا وطن تھا اور جہاں نوح علیہ السّلام کی کشتی ٹھہرنے کے بعد اُن کی نسل سکونت پذیر ہوگئی تھی۔ اُس غار میں تُو چالیس دن تک بیٹھ کے چلّہ کھینچ اور کوشش کر کے اِس مدّت میں ہر چوتھے دن صرف تھوڑی سی بناتی قُوتِ لایُموت پر زندگی بسر کر۔ یہ بھی ضروری ہے کہ پورے چلّے بھر صرف ایک صورت تیری نظر کے

سامنے ہو اور صرف ایک خیال تیرے دل میں ہو۔ وہ صورت تو میری ہے اور خیال اُن مُرشدِ کے ملنے کا جن کے مُریدوں میں شامل ہونے کو تُو غار سے نکل کے روانہ ہوگا۔ اِس چلّے کی تنہائی میں تُو اکثر دیکھے گا کہ میں تجھے اپنی طرف بُلا رہی ہوں۔ مگر خبردار! اس خیالی پیکر کے دھوکے میں نہ آنا۔ کہیں ذرا بھی تیرے قدم کو لغزش ہوئی تو سمجھ لے مجھ سے ملنے کی کوئی اُمید نہیں۔

چالیس دن کے بعد پچھلی رات کو اس غار اور کوہِ جودی کی گھاٹیوں سے سرزمینِ شام کو روانہ ہو اور بغیر اُس کے کسی اور جگہ مقام نہ کرے۔ بخطِ مستقیم شہرِ خلیل میں جائے۔ وہاں کے مشہور تہ خانے میں حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے جنازے رکھے ہوئے ہیں۔ لوگوں سے آنکھ بچا کر اُتر۔ لوگ تجھے روکیں گے۔ مگر ایسی کوشش کر کہ نگہبان اور مجاوروں کو خبر نہ ہو اور تُو اندر پہنچ جائے۔ چالیس دن تک اِن دونوں جنازوں کے درمیان بیٹھ کر چِلّہ کھینچ۔ پھر وہاں سے نکل کر شہرِ حلب کو جا۔ وہاں محلہ رامنہ کے عقب میں تجھے ایک چھوٹی سی مسجد ملے گی جو مسجدِ الثمانین کہلاتی ہے۔ اس مسجد میں جا کے ٹھہر۔ دوسرے ہی دن نمازِ فجر کی جماعت میں ایک شخص آئے گا جو صوف کے کپڑے پہنے ہوگا۔ اس کے بال لمبے ہوں گے اور ایک سیاہ کملی میں اپنا سارا جسم چھپائے ہوگا۔ اس شخص کی چھوٹی سی ڈاڑھی میں نصف سے زیادہ بال سفید نظر آئیں گے اور اس کا عمامہ سبز ہوگا۔ اس لیے کہ ساداتِ بنی فاطمہ سے ہے۔ اِس نورستان میں اگرچہ وہ اور کسی خطاب سے یاد کیا جاتا ہے مگر اُس عالمِ عناصر میں اُس کا نام شریف علی وجودی ہے۔ یہ شخص اگرچہ بالکل منکسرانہ مزاج وضع کیے نظر آئے گا مگر اس کی آنکھوں سے ریاضت و نفس کشی اور جذباتِ روحانی زیادہ ہونے کی وجہ سے شعلے نکلتے ہوں گے۔ خوب یاد رکھ کہ جب تک تُو شریف علی وجودی کے سامنے نہ جا پہنچے گا، وہ تیری طرف توجہ نہ کریں گے۔ اُن بتائی ہوئی نشانیوں سے تُو اُنھیں پہچان

سکے گا۔ اُن سے میرا خواست گار ہونا۔ وہی شخص تجھ کو مجھ سے ملا سکتا ہے اور اُسی کے ہاتھ میں ہماری کامیابی ہے۔ اگر تُو میرا شیدا اور آرزومند ہے تو جب تک مقصد برآری نہ ہو شیخ کی خدمت اور غلامی کرنا۔ اگر تو پورے ایک سال تک شریف علی وجودی میں رہے گا تو کوئی ایسا موقع ضرور پائے گا جب کہ وہ ایک جوش اور ولولے میں آ کے انسان کو ملاءِ اعلیٰ کی سیر کرا دینے کا دعویٰ کریں گے۔ دعویٰ سنتے ہی ان کے قدموں میں گر کر اپنی دلی آرزو ظاہر کرنا۔ وہ بے شک منظور کریں گے۔ مگر اس کا خیال رہے کہ شیخ کے ہر حکم کی تعمیل، خواہ تیری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، بے عُذر اور بلا حُجّت کرنا:

بہ مے سجّادہ رنگیں کُن گرت پیرِ مُغاں گوید

اگر یہ سب مراحل تُو نے طے کر لیے اور شیخ کی اطاعت میں پوری سرگرمی اور گرم جوشی دکھا دی تو جان لے کہ میرا آغوش تیرے لیے کھلا ہوا ہے۔ تجھ سے زیادہ میں تیرے لیے حیران ہوں، بس اب جلدی اُس وادی میں پہنچ اور میری قبر کو چھوڑ اور مجھ سے ملنے کی کوشش میں استقلال و مستعدی دکھا۔

تیری مُشتاق و شیدا زُمُرد

حُسین اپنے جوشِ محبت میں احباب سے متنفر ہو جانے کی وجہ سے زمُرد کی پہلی وصیت اور اُس کے بعد گزشتہ خط پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اس خط کے بعد ممکن نہ تھا کہ گھڑی بھر کے لیے بھی اس وادی میں ٹھہر سکے۔ زمُرد کی محبت و وفا شعاری یاد آئی اور نہایت ہی جوش و خروش کے ساتھ زمُرد کی قبر سے رخصت ہوا۔

تنگ و تاریک گھاٹی سے بیزار دشواری سے سنبھل سنبھل کے نکلا اور اسی مقام پر پہنچا جہاں اپنے اور

زمّرد کے گدھوں کو درختوں سے باندھ کے چھوڑ گیا تھا۔ دونوں گدھے بندھے بندھے سُوکھ سُوکھ کے، سردی و برف باری کے صدمے اُٹھا کے مر گئے تھے۔ ان کی ہڈیاں درخت کے نیچے پڑی ہوئی تھیں۔ مگر یہ دیکھ کے نہایت ہی متحیر ہوا کہ قدیم گدھے کے بدلے اب ایک اور تازہ دم گدھا اس درخت میں بندھا اور کسا کھڑا ہے۔ خلافِ اُمید اس سواری کو پا کے اُس نے خداوند کریم کا شکر ادا کیا جس نے عالمِ نُور کے بہت سے رُموز اس دنیا ہی میں اس پر ظاہر کر دیے، اور آگے کی راہ لی۔ جہاں تک راستہ خراب اور پیچیدہ تھا، وہاں تک تو وہ گدھے کا دہانہ پکڑے ہوئے پا پیادہ گیا۔ جب صاف اور کشادہ زمین آ گئی تو اس خدا کی دی ہوئی سواری پر سوار ہو کے سیدھا مغرب کی طرف چل کھڑا ہوا۔ چونکہ اس کوہستان کا سلسلہ بھی مشرق سے مغرب کو گیا ہے، لہٰذا اس کے دامن میں بادیہ پیمائی شروع کی اور دو مہینے کی دشت نوردی کے بعد علاقہ آذربائیجان کے شہر تبریز میں جا پہنچا، جہاں سے کوہِ جودی دس بارہ دن کی مسافت پر ہے۔ تبریز ایسا بارونق شہر تھا کہ حسین کے دل میں آئی کہ دو دن ٹھہر کے سیر کرے۔ مگر زمّرد کی تاکید یاد آئی اور بغیر اس کے کہ کارواں سرائے میں کمر بھی کھولی ہو، آگے کی راہ لی اور دس روز دشت نوردی کے بعد کوہِ جودی کی سر بفلک چوٹی کے نیچے جا کھڑا ہوا۔

کوہِ جُودی بہت بلند پہاڑ ہے، اور ایران اور ایشیائے کوچک بلکہ سلسلۂ کوہِ قاف کی اکثر چوٹیوں سے زیادہ بلند ہے۔ حسین پہلے ایک بڑا چکر کھا کے اس زبردست اور برف سے ڈھکے ہوئے قعلے کے مشرقی پہلو پر نکل گیا اور اُس غار کو ڈھونڈنے لگا جس میں اُسے چلّہ کشی کرنا تھی۔ کئی روز تک چٹانوں اور گھاٹیوں میں ٹکراتے رہنے کے بعد وہ غار ملا۔ دور دور کے گاؤں والے اکثر اس غار کی زیارت اور اِس کے تاریک دہانے پر کچھ نہ کچھ چڑھانے کو آتے رہتے تھے۔ لوگوں میں اس کی

قدیم برکتوں کے بہت سے قصّے مشہور تھے اور یہود و نصاریٰ و مسلمان سب اُس کی حرمت اور ادب کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انھی گاؤں میں ایک زائر کی زبانی حسین کو غار کے حالات معلوم ہوئے اور سمجھ گیا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں اسے اپنی ریاضت اور نفس کشی کا پہلا امتحان دینا ہے اور جہاں جنابِ ابراہیم علیہ السلام نے خدا کو پہچانا تھا۔

دن کو جب حسین اس غار کے دہانے پر پہنچا، وہاں اضلاعِ جُودی و لبنان کے چند خوش عقیدہ زائروں کا مجمع تھا۔ شام کو ان کے واپس جانے کے بعد جیسے ہی آفتاب غروب ہوا، وہ خدا کا نام لے کر اندر گُھسا۔ غار میں جاتے ہی ریاضت میں مشغول ہو گیا اور کوشش کرنے لگا کہ وہاں کی بھیانک تاریکی میں زُمُرد کی خیالی تصویر کا چراغ بنا کے ہر وقت نظر کے سامنے رکھے، چوتھے دن پچھلی رات کو نکل کے گھاس اور پتوں سے بھوک کی حدّت کم کر لیتا اور پھر اسی خلوت کدے میں جا بیٹھتا۔

آخر چلّہ پورا کر کے پری وش نوجوان نے شام کی راہ لی۔ تین مہینے کے سفر کے بعد مقدّس شہر خلیل کی عمارتیں نظروں کے سامنے تھیں۔ آبادی میں داخل ہو کے سیدھا اس تہ خانے پر پہنچا، مگر یہاں نیچے اُترنا بہت دشوار تھا۔ اس لیے کہ ہر وقت لوگوں کا مجمع رہتا اور خرابی یہ تھی کہ جو کوئی اس مقدس غار میں اُترنے کا ارادہ کرے، پہلے اجازت لے۔ لہٰذا عام مجاورین کو دوست بنا کر اجازت حاصل کرنے کے لیے راستے کے قریب ہی شب باش ہوا۔ کئی راتیں جاگ کر کاٹیں مگر موقع نہ ملا۔ اس لیے کہ اکثر لوگ یہاں پاس ہی شب بیداری کرتے تھے، اور ایسا کوئی وقت نہ ملتا جب کہ لوگ مصروف دُعا و عبادت نہ ہوں۔ دو تین ہفتے کے بعد ایک مرتبہ پچھلی رات کو اُٹھ کے دیکھا تو میدان صاف تھا اور جو لوگ تھے، وہ سو رہے تھے۔ چُپکے چُپکے دبے پاؤں تہ خانے کے دروازے پر گیا

اور چاروں طرف دیکھ کے اطمینان کرلیا کہ کوئی نہیں دیکھ رہا تو بے تکلّف نیچے اُتر گیا۔

اس مقام پر جانا بڑی جرأت اور ہمت کا کام تھا۔ اُن انبیائے عظام کا رُعب ساعت بساعت دل پر غالب آتا جاتا تھا۔ پاؤں کانپ رہے تھے اور دل دھڑک رہا تھا۔ تاہم زمّرد کا شوق ان تمام دلی کمزوریوں پر غالب آیا۔ وہ برابر بڑھتا چلا گیا۔ بار بار اُسے معلوم ہوتا جیسے فرشتے روک رہے ہیں کہ اس مقدس جگہ کو اپنے قدموں سے ناپاک نہ کر۔ مگر ان سب خیالات کو مٹا مٹا کے وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہاتھوں اور پاؤں سے ٹٹولتا ہوا تہ تک پہنچ گیا۔ رات کا وقت اور پھر وہ تاریک مقام، حسین پہنچ کر پریشان ہوا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، بزرگ پیغمبروںؑ کے جنازے کیونکر نظر آئیں گے۔ عرصے تک ایک ہی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ اب دل کو مضبوط کر کے آمادہ ہوا کہ ٹٹول کے آگے بڑھے کہ ناگہاں صبح کی شعاعیں اُوپر سے پہنچیں اور وہ ٹھہر گیا کہ روزِ روشن ہولے تو زیادہ آسانی سے اپنے مقصودہ مقام پر پہنچ سکوں گا۔ اور یہی ہوا۔ دن کی روشنی نے اندھیرا کم کر دیا اور اسے کئی لاشیں چبوترے پر رکھیں نظر آئیں جن میں سب کے درمیان حضرت یعقوبؑ و یوسفؑ کے جسم تھے۔ اُن کا انتقال چونکہ مصر میں ہوا تھا، لہٰذا قدیم مصریوں کے مذاق پر ان کی ممیاں بنائی گئی تھیں۔ اُن کے جسم آئینے کے تابوتوں میں تھے، جن سے اس تاریکی میں ایک عجیب رُعب وجلال برستا نظر آتا تھا۔

حسین یہ مقدس چہرے دیکھ کے سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ کسی طرح قدم آگے بڑھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ چند لمحے تک مرعوب اور سہما کھڑا رہا اور پھر جی کڑا کر کے قدم آگے بڑھایا اور دونوں کے درمیان میں جا کے چپکے سے بیٹھ گیا، جہاں دونوں کے باہیبت چہرے ہر وقت اس کے پیشِ نظر رہتے اور ان کا رعب اس قدر غالب تھا کہ زمّرد کے خیال کو وہ مشکل سے آنکھوں کے

سامنے متشکل کرسکتا تھا۔ مگر کوہِ جُودی کے چلّے کی کوشش نے وہ پیاری صورت زیادہ استقلال کے ساتھ نظر کے سامنے قائم کردی اور تھوڑی ہی کوشش سے اِن دونوں متبرک چہروں کے درمیان میں وہ اپنی معشوقہ کا جلوہ دیکھ لیا کرتا تھا۔

الغرض یہاں بھی وہ چلّہ کشی میں مشغول ہوگیا۔ یہاں کوہِ جُودی کے غار کی طرح یہ ممکن نہ تھا کہ کسی وقت نکل کے قُوت لایُموت حاصل کرے۔ اس کا خیال اُسے پہلے سے تھا اور اس ضرورت سے تھوڑا سا پنیر اپنی چادر میں باندھ کر لیتا آیا تھا۔ دو تین ٹکڑے چوتھے دن کھا کے شکر گزار ہوتا۔ خدا خدا کر کے یہ چلّہ بھی پورا ہوا۔ اکتالیسویں رات کو وہ چپکے چپکے اور دبے پاؤں باہر نکلا کہ کسی کو خبر نہ ہو، اور وہ حلب کی راہ لے۔ مگر لوگ جاگ رہے تھے جن میں سے بعض اُسے پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ اُنھوں نے دیکھتے ہی غُل مچا کے حملہ کیا اور وہ غار سے نکلتے ہی مجاوروں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔ قریب تھا کہ قتل کر ڈالا جاتا، مگر اتفاق یا اس کی خوش قسمتی سے ایک روز ایک باطنی فدائی کے ہاتھ سے شہرِ خلیل کا حکمران مار ڈالا گیا تھا۔ لوگ اگر چہ باطنیہ لوگوں سے ڈرتے تھے مگر آخر بڑا اہم معاملہ تھا۔ وہ انتقام کے درپے تھے اور باطنیوں کے ایک گاؤں پر تاخت کرنے کا سامان کر رہے تھے کہ باطنیوں کا ایک بڑا بھاری گروہ خود ان پر آپڑا۔ سخت خون و قتل ہوا۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور اِسی بے امنی کی حالت میں حسین مجاوروں کی قید سے چھوٹ کر حلب روانہ ہوا۔

آٹھویں دن شام کے وقت حلب میں داخل ہوا۔ راہ گیروں سے پوچھتا ہوا محلّہ رامنہ اور پھر مسجد اشمانین میں پہنچا۔ یہاں آتے ہی کمر کھول دی اور سرِ شام ہی کچھ کھا پی کے عشاء کی نماز پڑھی اور سوگیا۔ اگر چہ تھکا ماندہ تھا مگر زمّرد کے وصال کا شوق سر پر غالب تھا۔ آدھی رات سے زیادہ نہ گزری ہوگی کہ آنکھ کھل گئی اور صبح تک نمازِ فجر کے انتظار میں کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح کی اذان سے

پہلے ہی وضو کر کے تیار ہو گیا اور دروازے پر بیٹھ کے ہر آنے والے کی صورت کا مُطالعہ کرنے لگا۔ آس پاس کے مکان والے نیند کے خمار میں لڑکھڑاتے اور ٹھوکریں کھاتے آتے اور وضو میں مشغول ہو جاتے۔ حسین کو اکثر لوگوں پر شیخ شریف علی وجودی کی صورت کا دھوکا ہوا۔ مگر کسی طرح اطمینان نہ ہوتا تھا۔ آخر دل ہی دل میں پریشان ہونے لگا اور اپنی طرف خطاب کر کے چپکے سے کہا:

''مجھے یقین نہیں کہ شیخ سے مل سکوں۔'' یہ جملہ اُس کی زبان سے نکلا ہی تھا کہ اُسی حلیہ و وضع کا ایک شخص آیا، اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور نہایت تسلی و تشفّی کے لہجے میں بولا حسین، میں جانتا ہوں کہ تو میری تلاش میں آیا ہے۔'' اتنا سننا تھا کہ حسین ان کے قدموں میں گر پڑا، اور ان کے پاؤں کو اپنے آنسوؤں سے دھو کے کہنے لگا:

''یا حضرت! میری مدد کیجیے! صرف آپ ہی کی راہبری سے مجھے حق کا راستہ مل سکتا ہے۔ جس صراطِ مستقیم پر چل کے انسان خدا اور عالمِ ارواح کو پہچان سکے، وہ صرف آپ ہی جانتے ہیں''۔

شیخ: (جلال میں آ کے) اے بحرِ وجود اور دریائے وحدت کے ذلیل و ناپاک قطرے! تیرا کیا حوصلہ ہے کہ اس غیر موجود اور لاہُوتِ غیر ممنون کے رموز کو سمجھ سکے۔

حسین: بے شک میری کوئی ہستی نہیں۔ مگر جب آپ سے شناورِ بحرِ وحدت کا ہاتھ پکڑ لوں گا تو کیا عجب کہ اس طوفان خیز دریا سے پار ہو جاؤں''۔ اور یہ کہہ کے رو رو کے پھر شیخ کے قدم چُومنے لگا۔

شیخ کا جلال کسی قدر کم ہوا۔ انھوں نے حسین کو پکڑ کے اُٹھایا اور سینے سے لگایا اور اپنا سینہ کئی دفعہ زور سے اس کے سینے سے رگڑا اور کہا ''اچھا میرے ساتھ چل۔ میں تیرے ضبط و ظرف کا اندازہ کروں گا۔ اور جب معلوم ہو جائے گا کہ تیری طلب کہاں تک صادق ہے، اُس وقت تجھے اپنے حلقۂ

ذوق میں شریک کروں گا۔"

حسین نے یہ سن کے شکر گزاری کے طریقے سے سر اُٹھایا، شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور ان کے ساتھ جا کے نماز میں شریک ہوا۔ نماز کے بعد شیخ شریف علی وجودی اپنی خانقاہ میں لے گئے جو شہر سے کچھ فاصلے پر ایک غیر آباد مقام میں تھی۔ حسین کو یہ خیال کر کے تعجب ہوا کہ مسجدِ ثمانین کو کیا تخصیص ہے کہ شیخ وہاں فجر کی نماز ادا کرنے کو گئے تھے۔ اس کا راز دریافت کرنے کے لیے اس نے ادب کے ساتھ پوچھا کہ حضرت ہر روز نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے ہیں؟

شیخ: (بے پروائی سے) نہیں۔ صرف آج چلا گیا تھا۔

حسین: تو شاید کسی کام کے لیے اُدھر تشریف لے جانے کا اتفاق ہوا ہوگا۔

شیخ: (ذرا برہمی سے) لولاتجسسوا ان رموزِ معنی کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔ اگر سچا شوق ہے تو کبھی خود ہی سارا راز کھل جائے گا۔ اب حرفِ سوال تیرے منہ سے نکل ہی گیا تو لے بتا دیتا ہوں۔ سن! جو لوگ خدا کے انوارِ ازلی و سرمدی کا انعکاس اپنے دل پر کرتے ہیں، اُن کی آنکھوں سے حجاب کا پردہ اُٹھ جاتا ہے اور جہاں جہاں وہ نور الانوار اپنی کرنیں ڈالتا ہے، وہاں آنکھوں کی شعاعیں بھی پہنچ جاتی ہیں۔ میرا جسم مادی اسی خانقاہ میں تھا مگر ان آنکھوں کی شعاعیں کوہِ البرز کے پہلوؤں میں تھیں، جب زمرد کی تصویر تیرے سامنے اور میری جستجو تیرے دل میں تھی۔ پھر یہ شعاعیں اس تیرہ و تار تہ خانے میں تھیں جہاں یوسف و یعقوبؑ کے چہروں کے درمیان تو زمرد کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے تیری اس بے کسی کو دیکھا جب تو شہرِ خلیل کے مجاوروں کے ہاتھ میں اسیر تھا۔ تیری مدد کے لیے میں نے اپنے دوستوں کو بھیجا جنہوں نے شہر والوں پر حملہ کر کے تجھے اُدھر آنے کا موقع دیا۔ یہ کہتے وقت شیخ کی آنکھیں اس تیزی سے چمکیں کہ حسین بالکل تحمل نہ کر سکا اور شیخ کے قدموں پر سر

رکھ کے مجذوبانہ جوش کے ساتھ کہنے لگا:

''آپ سب جانتے ہیں۔کوئی راز آپ سے پوشیدہ نہیں۔میری آرزو اور تمنا بھی آپ کو معلوم ہے''۔

شیخ: (جوش وخروش سے) سب جانتا ہوں، مگر اِس کے اظہار کا وقت نہیں آیا۔اِس شوق کا تیری زبان سے ظاہر ہونا کسی خاص وقت، خاص حالت و کیفیت پر موقوف ہے۔بس اب اس وقت خاموش رہنا چاہیے۔

یہ حکم سن کے حسین اس قدر مرعوب ہوا کہ زمین پر پڑ کے کانپنے لگا۔تھوڑی دیر کے بعد شیخ نے اُسے اُٹھا کے بٹھایا، سینے اور آنکھوں پر اپنا دستِ برکت پھیر کے اُس کے دل کو تسلی دی اور کہا '' حسین !تو میری خانقاہ میں اور خاص میری صحبت میں رہا کر۔اور جس قدر زیادہ خدمت کرے گا اور جس مستعدی سے بے عذر و حجّت میرے احکام کی، جو دراصل احکامِ الٰہی ہیں، تعمیل کرے گا، اسی قدر جلد کامیاب ہوگا۔مگر یہ خوب سمجھ لے کہ ابھی تیرا ظرف اور تیرا دل اس قابل نہیں کہ فتوحاتِ ربّانی اور انقلابِ قدرت کے اسباب وعلل سمجھ سکے۔موسیٰ اور خضر کا قصّہ ہر وقت پیشِ نظر رکھ اور یقین کر لے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔نتائج ہمیشہ باطن میں مخفی ہوتے ہیں۔ظاہر پرست رموزِ قدرت کو نہیں سمجھ سکتے۔سزا اور جزا روح کے لیے ہے جو باطن پر متصرف رہتی ہے اور ہمیشہ دل کے اندر اور نیت پر حکمران ہے۔یہ ظاہری ارکان و جوارح اسی مادے میں مل جائیں گے اور نہیں رہیں گے۔لہٰذا ان حرکات کا کوئی اعتبار نہیں۔وہ قاضی و مفتی جاہل ہیں، نورالانوارِ یزدانی سے دور ہیں، جو ظاہری افعال و حرکات پر حکم دیتے ہیں۔خضر و موسیٰؑ کے قصے میں اُس لاہُوتِ اکبر نے موسیٰ کی تائید نہیں کی جو ظاہر پرستی کر رہے تھے۔بلکہ خضر کو موافق فیصلہ کیا جو رموزِ باطنی اور رازِ اخفا

کو سمجھ رہے تھے۔ اسی طرح دیکھو ابراہیمؑ نے بی بی کو بہن بتایا تو ظاہر پرست بہت گھبرائے کہ پیغمبر کی عصمت میں فرق آ گیا۔ یہ ان کی جہالت ہے، خُدا ابراہیمؑ کے دل کو دیکھ رہا تھا۔ الحاصل اے حسین! تو خوب سمجھ لے کہ ہر ظاہر کا باطن ہے اور خُدا باطن کا طرفدار ہے، تجھے شیخ اور مُرشد کی اطاعت آنکھیں بند کر کے اسی طرح کرنا چاہیے جیسی اطاعت کی خواہش خضر نے موسیٰ سے کی تھی۔''

حسین: (سینے پر ہاتھ رکھ کے) بے شک میں ایسی ہی اطاعت کروں گا۔ مگر کیا معاصی اور بُرے کاموں کے لیے بے سمجھے ارتکاب کر لینا چاہیے؟

شیخ: (نہایت جلال کے ساتھ اور آنکھیں سُرخ کر کے) کیا تجھے یہ گمان ہے کہ مُرشد بُرے کام کا حکم دے گا؟

حسین: (ڈر کے اور اخلاقی کمزوری کی شان سے) لیکن ممکن ہے کہ مُرید اور عقیدت کیش کو وہ فعل گناہ نظر آتا ہو۔

شیخ: ہاں، ممکن ہے، مگر اس کا باطن گناہ نہیں اور نتائج صرف باطن پر مرتب ہوتے ہیں۔

حسین: مگر اسی باطن پر جو مرتکب اور کرنے والے کے دل میں ہو۔ میں ایک فعل کا ارتکاب کروں تو اس کے نتائج اسی نیت پر مرتب ہوں گے جو میرے دل میں ہے۔ اگر مجھے اس کا باطنی رُخ اچھا نہیں معلوم ہو گا تو خواہ مخواہ میری نیت بھی بری ہو گی۔ اور جب میری نیت بری ہو گی تو نتیجہ بھی اس نیت کے مطابق بُرا ہونا چاہیے۔

شیخ: (جوش میں آ کے اور آنکھیں سرخ کر کے) تو کیا تیرے نزدیک شیخ کی نیت پر شبہ کیا جا سکتا ہے، اور اس سے پہلے رازاً ہوتی کے تسلیم کرنے سے تجھے انکار ہے؟

حسین: (شیخ کے قدموں میں گر کے) ہرگز نہیں، مگر میری باتیں محض اس لیے ہیں کہ لیطمئن قلبی۔ خداوند وہ دن نہ لائے کہ میں شیخ کی نیت پر شبہ کروں۔

یہ جواب سن کر شیخ نے حسین کو اُٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کی پیٹھ پر شفقت کا ہاتھ پھیر کے کہا" سُن! بے شک تیرے دل میں شکوک آتے ہوں گے۔ مگر اس راہِ باطن میں جو قدم آگے بڑھائے گا، تجھے نظر آئے گا کہ مُرید کی وقعت کیا ہے۔ سُن! مُرید بعینہٖ ایک تلوار ہے۔ جس کے قبضے میں شیخ کا ہاتھ ہے، اور تو سمجھ سکتا ہے کہ تلوار پڑے اور جس کا سر چاہے اُڑا دے۔ مگر الزام یا ظلم کی نسبت تلوار سے نہیں کی جا سکتی، مگر یہ چیزیں اسی طرح منسوب ہوتی ہیں جو تلوار کو ہاتھ میں لیے ہو۔ یقین ہے کہ اب تیرا شک رفع ہو گیا ہو گا اور تُو سمجھنے لگا ہو گا کہ مُرید کے افعال کا باطنی پہلو شیخ کی نیت سے متعلق ہے، نہ کہ خود مُرید کے ارادے سے۔ جب اس طرح اطاعت و مستعدی دکھا کے انسان ارادت کے مدارج طے کر چکتا ہے، اس وقت اعلیٰ درجے پر پہنچتا ہے۔ لیکن جب تک وہ ارادت کے درجے طے کر رہا ہے، اس کے ارادوں اور اس کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس وقت تک اس کے فعل کا ذمّے دار شیخ اور مُرشد ہے۔

حسین: (جوش و خروش سے شیخ کا ہاتھ چوم کے) بے شک بجا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے حقیقت کا پردہ اُٹھ گیا اور مجھے کسی حکم کی تعمیل میں عُذر نہ ہو گا۔

شیخ: حسین! مُرید کے سر پر بڑی نازک ذمّے داری ہے۔ اس سے زیادہ نفس کُشی کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے دل اور اپنی عقل کو اپنے افعال سے بالکل الگ رکھے۔ مگر تو غور کرے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ احکامِ الٰہی اور رفتارِ زمانہ کے بالکل موافق ہے۔ جن کاموں کی تعمیل خضر نے کی اور جن میں موسیٰ کی مدد لی، ان کا باطنی پہلو صرف خضر کے دل میں تھا اور موسیٰ کی نیت میں وہ قطعی

معاصی نہ تھے۔ مگر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ موسیٰ نے گناہ کیا اور اتنے بڑے بڑے کبیرہ گناہوں میں شریک ہوئے۔ ایسا اس لیے کہ اِس عالمِ باطنی میں خضر مُرشد اور موسیٰ مُرید تھے۔ اس کی تعمیل خود ظاہر پرستوں میں روز ہوتی رہی ہے۔ طبیب بظاہر نہایت سمّی دوا دیتا ہے اور مریض اگر چہ اس کے منافع سے بے خبر ہے

مگر بلا تامّل کھالیتا ہے۔ ماں باپ لڑکے کو کسی کام پر مارتے ہیں۔ لڑکا اس کام کو دل میں اچھا سمجھ لیتا ہے۔ مگر ماں باپ اپنے دل میں اور اپنے ہی خیال کی مُضرت کی تمنا پر مارتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ ہر ایک کے نزدیک اچھا ہوتا ہے۔

یہ تقریر ایسی موءثر تھی کہ حسین اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ لا سکا اور پھر ایک نہایت ہی بے خودی کی وضع سے جوش میں آ کے چلّایا ''بے شک! آپ بجا فرماتے ہیں۔ میرے دل کو اطمینان ہو گیا۔ میں کبھی بھی کسی حکم سے سرتابی نہیں کروں گا''۔

اس علمِ غیب اور اس مدلّل تقریر نے حسین کو شیخ علی وجودی کا ایسا گرویدہ بنا دیا کہ اُس کی نظر میں سوائے شیخ کے اور کسی چیز کی ہستی نہ تھی۔ اُس کے کانوں میں ہر وقت شیخ کی آواز گونجتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہر گھڑی شیخ کی تصویر پھرتی اور اس کے دل میں ہر لحظہ شیخ کے احکام کا انتظار رہتا۔ زمّرد کی تصویر بھی اب اس طرح پیشِ نظر نہ تھی بلکہ کبھی خانقاہ کے حجرے میں لیٹ کے وہ زمّرد کے خیال کی طرف متوجہ ہو کے کہتا ''پیاری زمّرد! مجھے تو نے کہاں بھیجا ہے کہ خود تجھے بھولا جاتا ہوں''۔

الغرض اب پورے کمال کے ساتھ اُسے فنا فی الشیخ کا درجہ حاصل تھا۔ اُس کو ارادت وعقیدت مندی کے ساتھ شیخ کی خدمت کرتے بارہ مہینے گذر گئے۔ اس زمانے میں ایک مرتبہ تین مہینے کے لیے

غائب رہے اور کسی ایسے سفر پر گئے جس کا انہوں نے بالکل راز میں رکھا۔ حسین ان کی غیبت میں بھی خانقاہ میں رہا۔ مگر اتنی مدّت میں اسے معلوم ہوگیا کہ شیخ علی وجودی کے مُرید ومعتقدین کن کن شہروں میں اور کتنے کتنے پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کا معمول تھا کہ سال میں ایک مرتبہ دور دراز کا سفر کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نئے نئے عجیب وغریب احکامات سن کر واپس جاتے۔ جن کی فوری تعمیل ہوتی۔ ایک طرف خراسان، مکران، سیستان، فارس، رودبار آذربائیجان، عراقِ عرب اور عراقِ عجم کے مُرید آتے اور دوسری طرف عمّان، حضر موت، حجاز، یمن، زنجبار، مصر، طرابلس الغرب، الجزیرہ اور تمام علاقہ افریقہ اور ایشیائے کوچک کے معتقد۔ یہ سب لوگ مختلف وضع ولباس میں ہوتے اور پوشیدہ اکثر راتوں کو دیکھتا کہ شیخ کے خوشہ چین اور ارادت مند کن کن اقطاعِ عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور اتنے بڑے اثر اور حکومت کے ساتھ بظاہر وہ کس سادگی اور بے نفسی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

ایک رات شیخ کے گرد دس مریدوں کا مجمع تھا۔ حسین بھی نہایت ادب کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھا تھا اور شیخ کی زبانِ فیض ترجمان بہت بڑے بڑے رموزِ حکمی ورُوحانی کھول رہی تھی۔ ایک شخص نے جو مصر سے آیا ہوا تھا، ادب سے مگر شک کرنے کے لہجے میں کہا ''میری سمجھ میں نہیں آتا، انسان جب اس جسمِ خاکی کو خاکدان میں چھوڑ جاتا ہے تو جنت کی مسرتوں میں اُسے کیوں لطف آتا ہے''۔

اس کے جواب میں شیخ نے کسی قدر برہمی سے کہا ''بعینہٖ اس طرح کہ تم دنیا میں اِس جسم کے ساتھ مزے اُڑاتے ہو''۔

حسین: کیوں کر ہو؟ لذّت اور درد تو صرف جسم کے موافق سے ہیں۔

شیخ: (ذرا جوش میں آ کے) رُوح گو بے جسم ہوتی ہے مگر اُسے معلوم یہی ہوتا ہے کہ گویا جسم میں ہے۔

شخص: یہ کیوں کر سکتا ہے؟ جب مادّے کی کثافت ہی نہیں تو اُسے متشکل اور متحیّر کون چیز کر سکتی ہے؟

یہ سُن کے شیخ کی برہمی اعتدال سے زیادہ ہوگئی۔ انہوں نے حسین کو پکار کے قریب بُلایا اور کہا ''بتا! تُو جب کوہِ البرض کی گھاٹی، کوہِ جودی کے غار اور شہرِ خلیل کے تیرہ و تارتہ خانے میں تھا، اُس وقت میرے وہاں موجود ہونے اور تیری ہر حالت سے باخبر رہنے کا تجھے یقین ہے؟

حسین: (سینے پہ ہاتھ رکھ کر) بے شک، گو میری ناتواں آنکھیں نہ دیکھتی ہوں، حضرت کا جلوہ ضرور موجود تھا۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہاں کے رموز آپ کو معلوم ہو سکتے۔

یہ سُن کے شیخ نے ذرا فخر و ناز کی شان سے اردگرد کے لوگوں کو دیکھا اور سب کے بعد اُس شخص کے چہرے پر جس نے یہ شک کیا تھا اپنی تیز نظریں جما دیں۔ مگر اُس کے دل کو ابھی اطمینان نہیں ہوا تھا۔ وہ شیخ علی وجودی کی اتنی برہمی دیکھ چکنے پر بھی معترضانہ طریقے سے بول اُٹھا ''بے شک آپ وہاں موجود ہوں گے اور حسین کی ہر حالت کو دیکھ رہے ہوں گے۔ مگر صرف آپ کی روح تھی اور متشکل نہیں ہوئی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو حسین آنکھوں سے بھی آپ کے نورانی جمال کو دیکھ لیتا۔''

یہ سنتے ہی شیخ کو تاب نہ رہی۔ زور میں آ کے کھڑے ہوئے، آنکھوں کی چمک دوچند ہو گئی، منہ میں کف بھر آیا، اور اس شخص کی طرف دیکھ کر کہا ''یہ جسدِ ناپاک نہایت ہی سرکش ہے یا رُوح نُورُالانوار کے شہودِ باوجود کو نہ سمجھ سکتی ہے اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی کو یہ راز بھی معلوم نہیں کہ دنیا کیوں ہے اور یہ رُوح اس پنجرۂ خاکی میں ایک مُدت تک کیوں قید رکھی جاتی ہے۔ اس کا

راز مجھ سے سنو! میں وہ شخص ہوں کہ جوسرِ وشبستان اور عالمِ لاہُوت کا ایک آن میں دورہ کر آتا ہوں اوران رموز کو جو عرشِ اعلیٰ کے اطراف میں لکھے ہیں، پڑھ آتا ہوں۔ اصل یہ ہے کہ جسم میں آنے سے پیشتر روحِ مُجرّد میں صلاحیت نہیں ہوتی کہ کسی مادی مّسرت سے لطف اُٹھا سکے۔ اس وقت وہ محض مُجرّد ہوتی ہے اورحظوظ ولذائز سے فائدہ یاب ہونے کے طریقے سے بالکل بے خبر۔ صرف اسی چیز کا سبق لینے کے لیے وہ اِس جسم خاکی میں رکھی جاتی ہے۔ وہ محدود زمانہ جسے تم زندگی کہتے ہو اور ہم روحوں کے کمال حاصل کرنے کا مدرسہ، اس لیے ہے کہ رُوحِ لطیف اس مادّے کے ساتھ علائق پیدا کر کے ہر قسم کی لذّتوں اور ہر قسم کے الموں سے اتنی آشنائی پیدا کرے کہ اس سے علاحدہ ہونے کے بعد بھی جب چاہے اپنے آپ کو مُتحیر ومتشکل اور لذّت والم سے متاثر کر سکے۔ جس طرح کوئی شخص مدارج روحانی طے کرنے کے بعد یہ صلاحیت اورقوت حاصل کر لیتا ہے کہ رُوح اس کے جسم میں رہنے کی حالت میں بھی اپنے آپ کو غائب یا رُوحِ غیر متشکّل وغیر مُتّحیر بنالے، اسی طرح روحِ انسانی عموماً اس جسمِ خاکی کے حجرے میں بند ہو کے اتنا چلّہ کھینچ لیتی ہے کہ اس کے چھوڑ دینے کے بعد بھی جب چاہے اپنے آپ کو جسم اور شکل میں ظاہر کر دے۔ پھر اس کا کمال اس درجہ بڑھ جائے۔ بہت سے باکمال بزرگوں اورشہیدوں کو سُنا ہو گا کہ ان کے جسم تو قبر کے کونے میں پڑے سڑ رہے تھے مگر روح اکثر لوگوں کی نظر کے سامنے اپنی ہی یا کسی دوسری شکل میں نمودار ہوئی۔ صرف ایک رُوح ہے جس نے بغیر جسم میں آئے اس کمال کو حاصل کر لیا۔ اس سے مراد جبرائیل ہیں جو کبھی وحیہ کلبی اور کبھی دیگر پیکروں میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے نمودار ہوئے۔ مگر اس کا راز جاننے والا اس عالم میں سوائے میرے کوئی نہیں کہ جبرائیل نے یہ کمالِ روحی کیونکر حاصل کیا۔ سنو! مسیحؑ کی ولادت کا اسی زمرے سے تعلق ہے۔ یہ جبرائیل تھے جو مریم

صِدّیقہؓ کے جسم میں حلول کر کے مسیحؑ کی صورت میں متحیّر ہوئے اور تھوڑے زمانے میں اپنا روحی کمال حاصل کر کے چلے گئے۔ مسیحیوں کو دھوکا ہوا کہ خدا تھا۔ مگر نہیں، صرف ایک روح تھی جو ایک جسم سے جس میں دوسری روح بھی موجود تھی، کمالاتِ جسمانی حاصل کر کے آسمان پر چلی گئی۔ مسیحؑ کی روح ایک دوسری روح تھی جو اُن کے جسم میں تھی، مگر اسی کے ساتھ جبرائیل کی بھی ان کے پیکر میں اُتر کے چند روز ہی میں مسیحؑ کے جسم میں الوہیت کی شان نمودار کر کے غائب ہو گئی۔ مُردوں کا زندہ کر دینا یہ مسیحؑ کا کام نہ تھا بلکہ صرف جبرئیل کی ملکوتی قوت کا مشہور اور مسلّم نتیجہ جس کا لوگوں کو موسیٰؑ کے لیے مشاہدہ ہو چکا تھا۔ مگر جن کو خدا نے چشمِ بینا نہیں دی، آج بھی نہیں سمجھ سکتے اور مسیحؑ کے اس معجزے کو یاد کر کے پریشان ہوتے ہیں۔ الغرض یہی متحیّر و متشکل ہو سکنے کا کمال ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے ہر روح دنیا میں آئی ہے۔ اور یہاں سے جانے کے بعد اسی کمال کے مطابق جنت دوزخ میں اپنے کردار کا جزا و ثواب پاتی ہے۔ تم میرے کمالات سے ناواقف ہو۔ میں وہ شخص ہوں کہ خود ہی نہیں، ہر شخص کو اُس ملاءِ اعلیٰ پر پہنچا کے وہاں کی ہر چیز دکھا سکتا ہوں اور میرے اختیار میں ہے کہ جنت کے روحانی پیکروں کو اس جہنمِ خاکی کے سامنے لا کھڑا........"

شیخ نے یہیں تک کہا تھا کہ حسین روتا اور التجا کرتا ہوا اُن کے قدموں پر گرا اور کہا "یا حضرت! مجھے مسئلے میں شک نہیں۔ مگر اتنی تمنا ہے کہ اس سرو شبستان اور جنت میں ہو آؤں۔ وقت ہو گیا کہ اپنی التجا آپ کے سامنے پیش کروں اور یقین ہے کہ محروم نہ رہوں گا۔"

حُسین دیر تک شیخ کے قدموں پر پڑا روتا رہا مگر شیخ اس قدر جوش میں بھرے ہوئے تھے کہ چند ساعت تک خاموش کھڑے رہے، پھر اس کو اُٹھا کے بٹھایا اور کہا "حُسین! میرے اس وقت کے جوش سے تو نے بڑا فائدہ اُٹھایا۔ خیر، اب اس وقت تو تامّل کر۔ کل تنہائی میں پھر درخواست کرنا۔

بے شک وقت آ گیا ہے کہ تجھے اس محنت و ریاضت کا پھل ملے۔ مگر ابھی تیرا امتحان باقی ہے اور سخت امتحان۔ مجھے دیکھنا ہے کہ تو نے کہاں تک اپنے آپ کو مُرشد کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ اور یاد رکھ کہ جس قدر تجھے مُرشد کا حکم بجالانے میں تامّل ہوگا، اسی قدر اپنا مقصد حاصل کرنے میں دیر ہوگی''۔

سب مُرید رخصت ہو کے چلے گئے۔ حسین بھی اس بچھونے پر لیٹا۔ مگر یہ رات اس نے نہایت ہی انتظار و اضطراب میں گزاری۔ اس لیے کہ آتشِ شوق تیز تر گرددکا مضمون تھا۔ صبح کو نماز کے بعد جیسے ہی شیخ علی وجودی نے وظیفے سے فراغت پائی، حسین ان کے قدموں پر گر پڑا اور چلّایا:

''اب زیادہ صبر کی تاب نہیں۔ آپ کو سب حالات خود ہی معلوم ہوتے ہیں، مجھے کہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ مگر خُدا کے لیے زمّرد سے جلدی ملایئے''۔

شیخ: بہتر۔ تو زمرّد سے ملے گا۔ اس کے وصل سے کامیاب ہو گا۔ مگر اس کے لیے اچھی طرح تیار ہے؟

حُسین: دل و جان سے تیار۔

شیخ: دیکھ، تجھے تامّل نہ ہو۔

حُسین: ذرا نہیں۔

شیخ: تیرے دل میں شک اور بدعقیدگی نہ پیدا ہو۔

حُسین: نہیں، ہرگز نہیں۔

شیخ: وہ جرأت کا کام ہے۔

حُسین: مَیں جان لڑا دوں گا۔

شیخ: اس میں خطرے بھی ہیں۔

حُسین: ہوں۔

شیخ: تو سُن!

حُسین: اِرشاد؟

شیخ: ابھی نہیں۔دل مضبوط کر لے۔

حُسین: خوب مضبوط ہے۔

شیخ: مجھے معلوم ہے کہ تو نے کتبِ درسیہ امام نجم الدین نیشاپوری سے پڑھی ہیں اور انھی کا تو مُرید بھی ہے۔

حُسین: (حیرت سے) بے شک، ہوں۔ پورے پانچ سال اُن کے حلقہء درس میں شریک رہا۔

شیخ: تیرے دل میں اُن کی کتنی وقعت ہے؟

حُسین: تمام عالم میں آپ کے بعد بس انھی کو بڑا عالم و فاضل، بہت بڑا خُدا شناس اور سب سے زیادہ متّقی و پرہیزگار سمجھتا ہوں۔

شیخ: خیر،تو جا۔اُن کے جلسے میں پھر شریک ہو اور جس وقت موقع ملے،اُن کو قتل......... شیخ کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا تھا کہ حسین نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔

تیسرا باب

ملاءِ اعلیٰ کا سفر

امام نجم الدین نیشا پوری اس عہد کے بڑے امام تھے۔تمام زمانے میں اُن کی نیک نفسی اور علم وفضل کی شہرت تھی۔شائد کوئی مقام ہو گا، جہاں ان کے شاگرد مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی مقتدائی نہ کرر ہے ہوں وہ حسین کے استادِ مرشد ہی نہیں بلکہ چچا بھی تھے۔ان کا اصلی وطن شہر کابل میں تھا۔ چھوٹی ہی عمر میں طلبِ علم کے شوق میں گھر سے نکل گئے تھے۔ دنیا کی بڑی بڑی درسگاہوں میں شریک ہو کے بغداد پہنچے۔ایک مدّتِ دراز تک مدرسۂ نظامیہ کی طالب علمی کی۔ پھر مشرقی بلاد کی سیاست میں مشغول ہوئے۔ بخارا وہرات کی علمی صحبتوں میں شریک ہوئے اور وہاں کے علماء کی درس گاہوں سے خوشہ چینی کر کے نیشا پور میں آئے اور وہیں ُمتوطّن ہو گئے۔ اب ان دونوں علم وفضل کے بڑے مرکز اور خدا شناسی کے نامور قطب بنے ہوئے تھے۔

حسین نے ایک ایسے نیک نفس اور باخُدا عزیز کے قتل کرنے کا حکم سُنا تو یکا یک کچھ ایسی حیرت و پریشانی ہوئی کہ بے ہوش ہو گیا۔شیخ علی وجودی نے اسے ہوش میں لانے کی تدبیر نہ کی بلکہ اسی طرح زمین پر پڑا رہنے دیا۔تھوڑی دیر تک وہ انتظار کرتے رہے کہ حسین خود ہی ہوش میں آ کے حکم بجالانے کا وعدہ کرے۔مگر جب اسے ہوش میں آنے میں دیر ہوئی تو اسی طرح چھوڑ کے ایک دوسرے حجرے میں چلے گئے۔شاید دو گھنٹے میں حسین کو ہوش آیا اور اس کے ساتھ ہی شیخ کا واجب ُالتعمیل حکم بھی یاد آیا۔قریب تھا کہ دریائے غفلت میں پھر ایک غوطہ لگائے، مگر سنبھلا اور اُٹھ کے چاروں طرف دیکھا۔شیخ علی وجودی غائب تھے اور تنہا وہی تھا۔

گزشتہ باتوں کو یاد کر کے حیرت کرنے لگا''کیا مجھے شیخ کی بات سمجھنے میں غلطی ہوئی؟ بے شک ایسا

ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایسے نیک نفس اور حقیقت بیں شیخ نے تو اس قسم کے سخت ظلم وگناہ کا حکم نہ دیا ہوگا ۔ مجھے قتلِ عمد کی ہدایت، اور قتل بھی کس کا؟ شیخ نجم الدین نیشا پوری کا جن سے بڑا عالم فاضل اس وقت صفحۂ ہستی پر نہیں ۔ یقیناً مجھ سے غلطی ہوئی۔ مگر فرض کرلیا جائے کہ شیخ نے یہی حکم دیا ہے تو بھی یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا کہ اپنے پیر ومُرشد اور باخدا چچا کو قتل کر ڈالوں۔ (کانپ کر) بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کیا کہے گی؟ اور پھر دین میں بھی تو ہے کہ مَن قَتَلَ مُؤمِناً مُتَعَمِّداً فَقَد کَفَرَ اس حکم کو بجالا کے سوا اس کے رُوسیاہیِ دارین حاصل کروں اور کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ خَسِرَ الدُّنیا وَ الآخِرَۃ کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن ہاں، شیخ نے کہا تھا کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔ اس میں بھی کوئی فائدہ ضرور متصور ہوگا۔ حقیقت میں وہ رموزِ قدرت جانتے ہیں۔ امام نجم الدین شیخ علی وجودی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور نہ خیال میں آتا ہے کہ شیخ علی وجودی کی نیت بُری ہے۔ کوئی تعجب نہیں اگر کسی روحانی مصلحت سے انھوں نے بظاہر ایسے مکروہ کام کا حکم دیا ہو۔ واقعی اگر یہی حکم ہوا تو مجھے تامّل نہ کرنا چاہیے۔ یہ میرا پہلا امتحان ہے۔ اگر ذرا بھی عذر کیا تو گناہ گار بھی ہوں گا اور زمُرد کے وصال سے بھی محروم رہوں گا۔ اس تعمیلِ حکم میں دینی فائدہ تو بدیہی ہے۔ کیونکہ شیخ کا امر واجبُ الاذعان ہے۔ باقی دنیاوی بدنامی تو اس کی ہستی نہیں۔ اگر کسی قدر ہے تو اس کے عوض میں کتنا بڑا فائدہ ہے کہ پیاری زمرد کی ہم کناری اسی زندگی میں نصیب ہو جائے گی۔'' دل میں یہ خیال جما کے حسین حجرے سے نکلا اور مختلف حجروں میں ڈھونڈتا ہوا اُس حجرے میں جا پہنچا جہاں شیخ علی وجودی تھے۔ اُن کی صورت دیکھتے ہی قدموں پر سر رکھ دیا اور چلّایا ''مجھے وہ حکم یاد نہیں رہا۔ جلدی بتایئے کہ تعمیل کو روانہ ہوں۔''

شیخ: دیکھو! اب کے تامل نہ ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمھارے دل میں بدگمانی پیدا ہوا اور تم اپنی

ساری محنت ضائع کر دو۔ خوب یاد رکھو کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔

حسین: خوب یاد ہے، اور مجھے ذرا تامّل نہ ہوگا۔

شیخ: تو جاؤ، امام نجم الدین نیشا پوری کو قتل کر دو۔

حسین: (دل مضبوط کر کے) بہتر۔ لیکن اگر میں مار ڈالا گیا؟

شیخ: کوئی مضائقہ نہیں۔ بلا زحمت زمرد سے جا ملو گے۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ ایسا نہ ہوگا۔

حسین: تو میں رخصت ہوتا ہوں۔

شیخ: ٹھہرو (ایک تیز خنجر نکال کر) اس خنجر کو اپنے پاس چھپا کے رکھو۔ جس وقت موقع ملے، اس سے کام لینا۔

مُرشد کا عطا کیا ہوا خنجر لے کر حسین نے اپنے استاد کی جان لینے کو مشرق کی راہ لی۔ ڈیڑھ مہینے بعد بغداد پہنچا۔ وہاں سے چل کے اِصفہان اور اِصفہان سے ایک مہینے بعد نیشا پور پہنچ گیا۔ حلب سے نکلے چار مہینے ہوئے تھے کہ امام نجم الدین کی درس گاہ میں حاضر ہو گیا۔ امام موصوف پہچانتے ہی بغل گیر ہوئے اور بے انتہا شفقت سے پیش آئے۔

گھر کے خطوط سے انھیں یہ خبر معلوم ہو چکی تھی کی حسین ایک شریف لڑکی کو ساتھ لے کے بدنامی کے ساتھ نکل گیا ہے، جس کا تذکرہ کر کے انھوں نے افسوس کیا اور کہا ''حسین، مجھے ایسی اُمید نہ تھی کہ علم کو اس ذوق وشوق سے حاصل کر کے تم اس کی بے حُرمتی کرو گے''۔

حسین: یا عّم! مَیں کسی بری نیت سے نہیں لے گیا تھا۔ زمّرد کا عقد میرے ہی ساتھ ہونے والا تھا

اور وہ حج کی بے انتہا مشتاق تھی۔ اس علمِ دین کی وجہ سے مجھے ناگوار ہوا کہ اُس کی دینی خواہش کا

خیال نہ کروں۔ بے تامّل ساتھ لے کر چل کھڑا ہوا۔

امام: اور اب وہ کہاں ہے؟

حُسین: جہاں طالقان کی گھاٹیاں ہیں۔ پریوں کے ہاتھ سے مار ڈالی گئی۔

امام: (مسکرا کر) ایسا مُہمل اور بے سروپا قصّہ بنانے سے کیا حاصل۔ اسے کوئی تسلیم ہی نہیں کرے گا۔

حُسین: جس بے تکلفی سے میں نے یہ قصہ بیان کر دیا ہے، اسی سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ میرے بیان میں کسی بناوٹ کا دخل نہیں۔

امام: خیر، اب یہاں کس غرض سے آئے ہو؟

حُسین: آپ کے حلقہ درس میں شامل ہونے کے لیے۔ زمرد کے غم میں مَیں نے ارادہ کرلیا ہے

کہ علائقِ دنیوی کو چھوڑ دوں اور چاہتا ہوں کہ باقی ماندہ زندگی تحصیل علم ہی میں صرف ہو جائے۔

امام: اگر ایسا ہے تو خدا تمھارے ارادے میں برکت دے اور تمھیں توفیق ہو کہ میرے بعد اِس درس گاہ کے مالک بنو۔

الغرض حسین، امام نجم الدین کے خوشہ چینوں میں شامل ہو گیا۔ اور چونکہ بھتیجا تھا، ان کے دل میں روز بروز اپنا زیادہ اعتبار پیدا کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنا موقع بھی ڈھونڈ رہا تھا۔ امام کثرت اوقات طلبا اور معتقدین کے مجمع میں رہتے جس کی وجہ سے تین مہینے گزر گئے اور حسین کو خنجر نکالنے کا موقع نہ ملا۔ چوتھے مہینے میں کچھ ہی دن گزر رہے تھے کہ اتفاقاً امام کو شدّت سے بخار آیا اور کئی دن تک درس و تدریس کا سلسلہ موقوف رہا۔ اس بیکاری کے زمانے میں اکثر طلباء تو ادھر اُدھر پھرتے

رہے مگر حسین نے امام کی تیمارداری میں انتہا سے زیادہ گرم جوشی اور سعادت مندی دکھائی۔ شب و روز ان کی دیکھ بھال اور خدمت گزاری میں مصروف رہا۔

امام کو بخار آئے چھٹا دن تھا کہ ایک رات کو اتفاقاً ان کے حجرے میں اکیلا حسین ہی تھا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی اور امام بچھونے پر لیٹے ناتوانی کی آواز میں اس سے باتیں کر رہے تھے۔ حسین خلافِ معمول آج خاموش تھا۔ ان کی باتوں پر ہونکاری تو ضرور کرتا جاتا تھا مگر اس کے سوا کوئی اور لفظ زبان سے نہ نکلتا تھا۔ کئی مرتبہ امام کو تعجب ہوا بلکہ کئی مرتبہ پوچھنے لگے کہ آج تم خاموش کیوں ہو؟ مگر حسین نے ''یوں ہی'' کہہ کے ٹال دیا۔ اور باہر نکل کر تاروں سے دریافت کرتا تھا کہ رات کتنی آئی۔ آخر آدھی رات گزر گئی اور حسین کو اطمینان ہو گیا کہ اب صبح تک کوئی نہ آئے گا۔ اِس بات کا یقین کر کے اس نے حجرے کا دروازہ خوب مضبوطی سے بند کر لیا اور پاس جا کے دیکھا اور امام کی بھی آنکھ لگ گئی تھی۔ دیر تک کھڑا ان کی صورت دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور ساعت بہ ساعت اپنے استاد اور بزرگ پر کاری وار کرنے کے لیے زیادہ تیار ہو جاتا تھا۔ اس قسم کے خون ریز کاموں سے وہ کبھی آشنا نہ تھا۔ دل کو زور دے دے کے اُبھارتا تھا مگر خیالات ایسا پلٹا کھاتے تھے کہ بار بار ہمت ہار دیتا۔ حجرے میں ہر طرف سے ایسی ایسی خیالی باتیں نظر آتیں اور ان کا ایسا رعب پڑتا تھا کہ معلوم ہوتا کہ جیسے فرشتہ یا کسی اور چیز کی غیر جسمانی مخلوق امام کی حفاظت کر رہی ہے۔ خود امام کا چہرہ اُس کے خیال کی آنکھوں میں نہایت ہی نورانی بن کے سفارش کرتا اور کبھی بھیانک اور مہیب نظر آ کے ڈرا دیتا۔ مگر ان سب خیالات کو اُس نے مٹایا، شیخ وجودی کا عطا کیا ہوا خنجر نکال کے اس کی باڑھ دیکھی اور یکایک دل مضبوط کر کے امام کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ امام نے چونک کر آنکھ کھولی تھی اور چلّانے ہی کو تھے کہ اس کا بایاں ہاتھ اُن کے منہ پر اور خنجر اُن

کے دل میں تھا۔

چند ہی لمحوں میں امام کی روح پرواز کر گئی۔ خون تمام حجرے میں پھیلا ہوا تھا۔ بے جان لاش خون آلود کپڑوں میں لپٹی ہوئی بستر پر پڑی تھی۔ اور گویا زورآوری کا کام نہ تھا۔ مگر حسین کے دل کو اتنی بڑی شدید حرکت ہوئی تھی کہ کھڑا کانپ رہا تھا اور بار بار اپنے ہاتھ کے معصوم شہید کی مظلومانہ لاش کو ڈر ڈر کے دیکھتا۔ آخر اس نے ان سب چیزوں کو اسی حال میں چھوڑا، حجرے کے خوف ناک منظر سے سہمی ہوئی آنکھوں سے آخری نظر ڈالی اور دروازہ کھول کے نکلا۔ حجرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا اور چپکے چپکے قدم اٹھاتا ہوا چلا۔ شاید زیادہ وقت نہ ہوا ہوگا کہ شہر کی خانقاہ سے دور نکل گیا۔ نیشاپور کے گرد نہایت ہی مضبوط فصیل تھی اور پھاٹک رات کو بند ہو جاتے تھے، جس کے سبب سے اس وقت اسے باہر نکلنے میں بہت دشواری نظر آئی مگر جان پر کھیل کر ایک تیرہ و تار بدرو کے ذریعے سے باہر نکلا اور نکلتے ہی نہایت تیزی سے بھاگا تاکہ صبح ہونے سے پہلے ہی دور نکل جائے کہ کوئی اُسے پا نہ سکے۔

دوسرے دن جب وہ شوق کے پیروں سے اُڑتا ہوا خراسان کے مغربی میدان اور جنگل قطع کرتا ہوا چلا جاتا تھا، اُس وقت اس کے حواس ذرا ٹھکانے ہوئے اور ظلم و گناہ یاد آیا جو ہر پہلو سے بُرا تھا۔ اس خیال کے دور کرنے کی برابر کوشش کرتا تھا مگر بار بار زبان سے ایک آہ کے ساتھ جُملہ نکل ہی جاتا تھا کہ میں بڑا گنہگار ہوں اور اس کا دل اور اس کا ایمان اس پر لعنت کرتا تھا۔ لعنت اور پھٹکار کی آواز کان میں آتی تھی اور چونک چونک کر کہتا کہ اس فعل کے ذمّے دار شیخ علی وجودی ہیں۔ مگر خود ہی دل میں قائل ہو جاتا کہ امام کا کام تو میرے ہاتھ اور میری سنگدلی نے تمام کیا ہے۔ ذمہ داری کسی اور کے سر کیونکر جا سکتی ہے۔ اب کے دل نے شیخ کے اصول میں بھی شک پیدا

کیا کہ مُرشد کے ہاتھ میں صرف ایک بے جان اور غیر ذمّے دار آلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ آپ ہی آپ کہنے لگا "نہیں۔ علمائے روحانین کا یہ مسئلہ اگر صحیح ہے کہ ثواب اور عذاب اسی لذت والم کا نام ہے جو اپنے کردار کے نتائج میں خود اپنے ضمیر اور دل کی تحسین وظلمت سے پیدا ہوتے ہیں تو انسان کے فعل کا دوسرا ذمّے دار نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو کہ میں نے ایک کام کیا۔ اور گو وہ کسی مشیر و صلاح کار کے خیال میں اچّھا ہو مگر میرے نزدیک بُرا اور قابلِ ملامت ہے، تو اس کے ارتکاب پر میرا دل مجھ پر ضرور لعنت کرے گا اور جب اسی لعنت کے عالم کو اصلاحِ شرح میں عذاب سے تعبیر کیا گیا ہے تو بے شک میں دوزخ اور عذاب سے نہ بچ سکوں گا۔

الغرض حسین کے دل نے اُسے قائل کر لیا۔ اب وہ پچھتا رہا ہے اور سخت روحانی تکلیف میں مبتلا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی شیخ علی وجودی کی وقعت بھی ویسی ہی دل میں موجود ہے۔ شیخ علی وجودی کی وہ ایسی ایسی کرامتیں دیکھ چکا ہے کہ ان پر بدگمانی نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعض اوقات ڈر جاتا ہے کہ شیخ غیب کے دلوں کے حالات سے واقف ہیں۔ میرے یہ شکوک کہیں ان کو معلوم ہو گئے تو غضب ہو جائے گا۔ ادھر سے بھی جاؤں گا اُدھر سے بھی۔ اتنے بڑے گناہ کے ارتکاب کے بعد زمّرد کے وصال سے محروم رہا تو حسرت ہی رہ جائے گی۔

حسین اسی قسم کے خیالات دل میں لیے ندامت کے دریا میں غرق اپنے فعل پر پچھتا تا ہوا شہرِ حاب میں داخل ہوا اور شیخ کے سامنے جاتے ہی قدموں پر گرنے کو ہی تھا کہ انھوں نے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا اور نہایت ہی جوش سے کہا "حسین! تو اچّھا امتحان میں پُورا اُترا۔ اب زمّرد تجھ سے زیادہ تیری مشتاق ہے۔ اُس نورُ الانوار کے انوارِ ازلی نے تیرے دل پر پورا انعکاس کیا اور تیرے جسم کی اِس مُشتِ خاک نے یہ صلاحیت پیدا کر لی ہے کہ اُس عالمِ نور اور سروشبستان کی تجلیات کی متحمل ہو

سکے‘‘۔

حسین: مگر یا حضرت! میرے دل میں اس ظالمانہ فعل کی نسبت طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

شیخ: (جوش میں آ کے) بے شک پیدا ہوتے ہوں گے۔ روح اس مادے کی کثافت سے بڑی بڑی دشواریوں سے علاحدہ ہوسکتی ہے اور صرف یہی چیز ہے جو ان شکوک اور شبہات کو پیدا کرتی ہے۔ وہ مرکزِ اشراق جو باوجود لاحّی ہونے کے حیاتِ سرمدی کا چشمہ ہے، اس جسمانی روح پر جو قفسِ عنصری میں مقید ہے، اپنے تنوعات وعشق آشکار کر سکتا ہے۔

حسین: مگر اطمینان بخش نصائح ارشاد ہوں کہ دل سے شبہات نکل جائیں۔

شیخ: سُن اے حسین: استقلال تیرے شکوک کو دور کر دے گا بشرطیکہ تو ان سے رفع کرنے کی کوشش کرنے میں مشغول رہے۔ مگر تیرے اطمینان کے لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں تکمیلِ نفس اسی کا نام ہے اور یہی منشا الہّیات کا ہے کہ روح کے تعلقات جسم سے علیحدہ کیے جائیں۔ جسمانی افعال پر تصرّف کرتے کرتے روح عادی ہو جاتی ہے کہ بلا استعانتِ مادہ کوئی کام نہ کر سکے اور وہ روحیں جو جسم کو چھوڑتے وقت انھی مادّیات میں پھنس کر رہ گئیں، وہ بعد میں بھی ہر وقت خود کو مادّے کے تیرہ وتار قفس میں پاتی ہیں۔ اور یہی چیز اصطلاحِ شرع میں ان کا دوزخ ہے۔ نجات کی کوشش یوں ہونی چاہیے کہ زندگی ہی میں روحی علائق جسم سے کم کر دیے جائیں۔ اس کوشش کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ جسم سے ایسے کام لیے جائیں جن سے روح کا تعلق نہ ہو۔ بیتاب ہو کے ان کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے اور انسان بہادری ومضبوطی سے اسے جبراً روکے۔ یہی الٰہیات کی آئین ہے۔ دوسری یعنی اقلیمِ وسطٰی یہ ہے کہ روح ایسے کام کرے جن سے جسم کا تعلق نہ ہو۔ جو لوگ دور

دراز شہروں میں اپنی روح سے اثر ڈال دیا کرتے ہیں، ان کی نسبت سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عالم روحانیات کے اس درمیانی فاصلے کو طے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد تیسرا درجہ ہے کہ قفس جسم سے اپنی علاحدگی حاصل کرے کہ اس نورالانوار کے انکشافات کی جستجو میں مادے سے مُبّرا ومُنزّہ ہو کے ملکوت اور عالمِ لاہوت کی سیر کرے۔ اس اعلیٰ جستجو کے زمانے میں جو کوئی مرجاتا ہے وہ جسمِ خاکی کو الوداع کہتے ہی اس نقطہء اولیٰ واجبُ العدل سے جاملتا ہے۔ اس وقت اسے وہ اعلیٰ کمالِ رُوحانی حاصل ہوتا ہے کہ جس کی تحصیل کے لیے اُس نے عالمِ مادّی کی یہ قید اُٹھا دی تھی اور خسجستان کے مصائب میں مُبتلا ہوا تھا۔ اب اس کی یہ حالت ہوئی ہے کہ ایک طرف تو تعلّقاتِ جسدی کی مادی تعلیمات سے اس سے یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ جب چاہے اس عالم کے سامنے اپنے آپ کو متّخیل ومتشکل کر دکھائے اور دوسری طرف اس میں کمالِ روحانیت وتجرّد اِس درجے کا ہوتا ہے کہ جب چاہے اس نقطہء ازل اور اولیٰ مرکزِ نورالانوار سے جا ملے۔ لہٰذا اے حسین! تو اس مدرسہء روحانیت کی ابتدائی جماعت میں ہے اور ابھی اِس امر کی مشق کر رہا ہے کہ تیرے ارکان و جوارح سے ایسے افعال وحرکات صادر ہوں جن کی طرف تو منسوب کرے، یہ لعنت ملامت جو تیرا نفس اور تیری روح تجھ پر کر رہی ہے۔ یہ اسی تعلقِ روحی کا نام ہے جس سے قطع کرنے کی کوشش تجھے کرنی چاہیے۔ اور جب تو یہ کمال حاصل کرلے گا کہ روح کو تیرے اعضاء کے کسی فعل کی طرف توجہ ہی نہ ہو، اس وقت دوسرے درجہء توحید میں قدم رکھے گا۔

حسین: تو میں اُن الزاموں اور ملامتوں کی پروا نہ کروں جو خود میرے دل سے مجھ پر پڑ رہی ہے؟

شیخ: ہرگز نہیں۔ اسی امر کی تجھے مشق کرنا ہے اور نوُرالانوار کی طرف توجہ کرنی ہی پہلا زینہ ہے۔

حسین: حضرت! آپ اُس خداوندِ جّل وعلاّ کو نوُرالانوار کیوں فرماتے ہیں؟ اس کی رمز میں

نہیں سمجھ سکا۔ وہ حضرت ربّ العزّت بے شک نور ہے مگر الانوار کیوں؟

شیخ: (برہم ہو کے) وہ نقطۂ وحدت اور سرچشمۂ تکوین اس سے بالکل منزہ ہے کہ ہم اپنے مادّی خیال کے صفات کو اس کی جانب منسوب کریں۔ اور وہ ایسا ہے کہ لَیسَ کَمِثلِہٖ شَیٔ۔

حسین: مگر خود اللہ جلّ شانہ، نے ان صفات کو اپنی طرف منسوب کر لیا تو ہمیں کیا تامّل ہے؟

شیخ وجودی کی برہمی کی اب انتہا نہ تھی۔ انھوں نے حسین کو غضب آلود اور سُرخ آنکھوں سے گھور کے دیکھا اور بولے:

''بے شک انسان ظلُوم وجہُول ہے۔ یہ تیرے خیال میں نہیں آتا کہ ہم محض اُسی کے ارشاد کے بموجب اُن صفات کو اس کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ہم اُسے نور کہتے ہیں، مگر چونکہ ہمارے خیال کے نور سے وہ منزّہ ہے لہٰذا اسے الانوار بھی کہہ دیتے ہیں۔''

حُسین: بے شک صحیح ہے۔ اب میرا اطمینان ہو گیا۔ اور انشاء اللہ کبھی اپنے افعال پر نہ پچھتاؤں گا۔ لیکن اُمیدوار ہوں کہ اب مجھے وہ سروشبستان دکھایا جائے جہاں میری زمّرد اجرامِ فلکی کے پہلو میں بیٹھی جلوہ افگنی کر رہی ہے۔

شیخ: بہتر۔

یہ کہہ کہ شیخ نے اُٹھ کے اپنی کتابوں کا صندوق کھولا۔ اُس میں سے ایک چھوٹی کتاب نکالی۔ پھر اُس کے ورق اُلٹے، ایک خط نکالا اور اُس کو حسین کے ہاتھ میں دے کے کہا ''لے'' اِس خط کو احتیاط سے رکھ اور اسی وقت روانہ ہو کے شہرِ اصفہان کی راہ لے۔ یاد رکھ کہ اصفہان کے شمالی پھاٹک کے باہر ایک شکستہ اور قریب الِانہدام مسجد ہے۔ اُس میں تُو ایک فقیر کو پاوے گا جو بظاہر بھیک مانگتا ہے مگر باطن میں ایک بڑا خدا شناس شخص ہے۔ یہ فقیر ہر وقت اپنے جسم پر دُنبے کی کھال اُڑھے رکھتا

ہے اور اِنکساراً یہ صدا لگا کر راہ گیروں سے مانگتا ہے کہ ''دہنِ سگ بہ لُقمہ دوختہ بہ''۔ کاظم جنوبی اس کا نام ہے۔ یہ خط لے جا کے اس کے ہاتھ میں دے اور میرا سلام کہہ۔ رات کو تجھے وہ ایک غار میں لے جائے گا جہاں تو ایک بڑے امامِ واقفِ اسرارِ سرمدی سے ملے گا۔ اسی وقت تو جنت کے مدارج طے کرنا شروع کر دے گا اور چند ہی روز کی زندگی میں جو زیادہ تر خواب کی سی ہوگی، فردوس بریں کے اعلیٰ منازل میں جا پہنچے گا۔

حسین نے خط لے کے شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ پھر رخصت ہونے کے طریقے سے ان کے قدم چومے اور اِصفہان کی طرف رُخ کر کے کھڑا ہوا۔ اب اس کا یہ سفر زیادہ اطمینان سے تھا۔ گناہ کی ملامت وندامت کے اثر کو شیخ علی وجودی کی تقریر نے اس کے دل سے بالکل محو کر دیا تھا۔ اُمید اور آرزو کا باغ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا زمّرد آ کے ہم کنار ہوا چاہتی ہے۔ اسی اطمینان اور ان ہی مسرتوں کے ساتھ بغداد ہوتا ہوا اصفہان پہنچا۔ شمالی پھاٹک کے باہر مسجد کے دروازے پر متّردد کھڑا تھا کہ کان میں آواز آئی ''دہنِ سگ بہ لُقمہ دوختہ بہ'' فوراً دوڑ کے مسجد میں گیا اور شیخ کا خط نکال کر کاظم جنوبی کے ہاتھ میں دے دیا جو دُنبے کی کھال اوڑھے بیٹھا زور سے صدائیں لگا رہا تھا۔

کاظم جنوبی نے حسین کو حیرت واستعجاب کی نظر سے دیکھا اور جوشِ وحشت کے لہجے میں چلّا اُٹھا ''حذر از اہلِ علم حذر'' مگر جب خط کو پڑھا تو فوراً اُٹھ کے بغل گیر ہوا اور کہا ''میں نہیں سمجھا تھا کہ شجر ِمعرفت کی ایک شاخ تم بھی ہو۔ آؤ بیٹھو۔ کھا پی کے آرام کر لو۔ رات ہو تو تم کو شیخ الجب کے پاس لے چلوں۔ اُنھیں حیاتہ الجب اختیار کرنی چاہیے۔ دن چونکہ مظہر النور ہے لہٰذا دن بھر وہ اپنے اُوپر انوارِ لاہوتِ اکبر کا انعکاس کرتے ہیں۔ اور رات چونکہ تیرہ وتار اور نمونۂ ظلمت ہے لہٰذا اسی

ظلمت میں وہ مادی پیکروں سے ایک گونہ علاقہ پیدا کرتے ہیں۔

حسین: مگر معلوم نہیں مجھ جیسے گناہ گارِ رُوسیہ کار سے وہ ملنا بھی پسند کریں گے؟

کاظم جنوبی: ضرور ملیں گے۔ شجرِ معرفت کی ایک شاخ تم ہو۔

حسین دن بھر اسی مسجد میں رہا اور شام کے بعد ایک ثلث رات گزر گئی تو کاظم جنوبی اسے ساتھ لے کے بیرون کوہستان کی طرف روانہ ہوا۔ بہت سے نشیب و فراز طے کر کے اور کئی گھاٹیوں سے گزر کر کاظم ایک بڑے غار کے دہانے پر ٹھہر گیا اور زور سے چلّایا:

''یا شیخ! ظلمتِ مادی میں ایک جگنو چمکا ہے''۔ مگر کچھ جواب نہ ملا۔ پھر کاظم جنوبی نے پکار کے کہا'' ایک آئینے سے پردہ اُٹھا، جو تجلیات انوارِ لاہُوتی سے منعکس ہونا چاہیے۔ اب بھی کوئی جواب نہ ملا۔ پھر کاظم جنوبی نے پکار کر کہا'' ایک آخشیجی پیکر کا مقید سروشبستان جانے کے لیے مُصِر ہے''۔ اس تیسری ندا پر غار کے اندر سے چٹانوں سے گونجتی ہوئی اور اندھیرے میں سنسناتی ہوئی آواز آئی۔ ''مرحبا! جوانِ آملی مرحبا! جنت کی ایک حورِ دوسال سے تیرے فراق میں بے تاب ہے۔ مَیں نے اپنی سیرِ لاہُوتی میں ایک طرف اس حُور کو فردوسِ بریں کے گوشوں میں روتے اور دوسری طرف تجھے راہِ طلب میں قدم مارتے دیکھا ہے۔ اب یہیں سے تجھے لذائذ سروشبستانی حاصل ہونے لگیں گے۔ قُدرت کے کرشمے دیکھ''۔ اِس جملے کے ساتھ ہی غار کی تہ میں ایک روشنی نمودار ہوئی اور کاظم جنوبی نے حسین سے کہا:

''بس آگے میں نہیں چل سکتا۔ مجال نہیں کہ ایک قدم بھی آگے جاؤں۔''

حسین: کیوں؟

کاظم جنوبی: اگر یک سرِ مُوے برتر پَرم

فروغِ تجلّی بسوزد پَرم

جاؤ اور یقین جانو تم شجرِ معرفت کی ایک شاخ ہو۔

یہ سنتے ہی حسین نے کاظم جنوبی کو اوپر چھوڑا، خود جوشِ دل کی بے خودی میں اُمید و آرزو کے خواب دیکھتا ہوا غار میں اُترا۔ تھوڑی دیر تک تو اِدھر اُدھر کی چٹانوں سے ٹکریں کھاتا رہا مگر آخر کار انتہا تک پہنچ گیا جہاں اُسے داہنی طرف ایک زینہ ملا۔ اس زینے کے ذریعے سے اور زیادہ نیچے گیا تو اپنے وہم و گمان کے خلاف اس خوفناک کوہستان اور درندوں کے مسکن کے نیچے ایک نہایت وسیع، عالی اور بہت بارونق مکان نظر آیا جس میں ہر طرف کافوری شمعیں روشن تھیں اور عود و لوبان سلگ رہا تھا۔ در و دیوار پر طلائی رنگ کے نقش و نگار بنائے گئے تھے اور ان بیل بوٹوں میں رنگین پتّھر اور شیشے کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے جن پر شمعوں کا عکس پڑ کے ہر سمت ایک عجیب عالم پیدا کرتا تھا۔ حسین اس تمام سامانِ عیش کو دیکھ کر مبہوت و خود رفتہ ہو گیا اور بے صبری کے جوش میں چلّا اٹھا ''کیا فردوسِ بریں یہی ہے؟'' کہیں قریب ہی تسلی آمیز لہجے میں آواز آئی ''مگر سروشبستان کے بسر کرنے کے لیے یہ پہلی منزل ہے، جہاں ٹھہر کے وہ اس قابل بنائے جاتے ہیں کہ جنت کی مسرتوں کو یکا یک دیکھ کے از خود رفتہ نہ ہو جائیں۔''

حسین: ''مگر آپ کون ہیں، اور کہاں ہیں کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کے شکر گزار ہوں؟''

''میں تیرے قریب ہی ہوں'' ناگہاں ایک آواز آئی۔ منقش پردہ جو پہلے دیوار کا دھوکا دے رہا تھا، کھنچ کے نظر سے غائب ہو گیا اور ایک معمّر قوی الجثہ نہایت ہی نورانی صورت کا آدمی نظر آیا جو زرتار مسند پر گاؤ تکیے سے لگا ہوا عجیب بے پروائی اور بے نیازی کی شان سے بیٹھا تھا۔ اُس کا نورانی چہرہ آئینہ کی طرح صاف تھا اور اُس وقت چاروں طرف سے شمعوں و نیز در و دیوار کے

شیشوں کی ضو پڑنے سے آفتاب کی مثل چمک رہا تھا۔ سفید لمبی ڈاڑھی آفتاب کی کرنوں کی طرح چمک رہی تھی۔

حسین یہ نورانی صورت دیکھتے ہی پروانے کی طرح دوڑ کے قدموں پر گر پڑا اور کہا ''فرمایئے، آپ کون ہیں؟ شاید رضوان آپ ہی کا نام ہے؟''

پیر مرد: نہیں۔ ابھی تُو اسی تیرہ خاک دانِ عُنصری کی حدود میں ہے۔ مگر ہاں، تیری آنکھوں پر سے پہلا پردہ اُٹھا ہے۔ اہلِ دنیا مجھے شیخ الجبل (غاروالا شیخ) کہتے ہیں مگر اہلِ حقیقت کی اصطلاح میں طورِ معنیٰ کہلاتا ہوں۔

حُسین: (حیرت سے) طورِ معنیٰ حقیقت میں وہی نور ہو گا جو موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر نظر آیا تھا۔

طورِ معنیٰ: مگر تُو اُسے ستّر ہزار حجابوں کے اندر سے دیکھ رہا ہے۔

حُسین: لِللہ وہ سب پردے بھی اُٹھا دیجیے۔

طورِ معنیٰ: ابھی ان مادّی کثیف آنکھوں میں اِس کی قابلیت نہیں۔ مگر صبر کر۔ اِسی کا سامان ہو رہا ہے۔ یہ سب پردے اُٹھ جائیں گے۔

یکایک ایک خوبصورت نوعمر لڑکے نے آ کے ایک شربت کا لبریز جام طوۂ رِمعنی کے ہاتھ میں دے دیا اور طوۂ رِمعنی نے اپنے ہاتھ سے حسین کی طرف بڑھا کے کہا ''اس جام کو پی اور ملکوت سے ایک درجہ اور قریب ہو جا۔'' حسین نے وہ جام فوراً پی لیا جس کے ساتھ ہی اس کا دماغ چکر کھانے لگا اور طورِ معنی کے ساتھ لپٹ کے غافل ہو گیا۔ اِس غفلت اور خود وارفتگی کی نیند میں کئی دفعہ اُس کی آنکھ کُھلی اور ہر مرتبہ اپنے آپ کو نئے مقام میں پاتا تھا۔ کسی سر سبز و شاداب میدانوں میں ہوتا اور کبھی

وحشت ناک اور پُرخطر گھاٹیوں میں۔ ہر بیداری میں فرشتہ یا انسان، مگر غیر معمولی قسم کے لوگ، اسے سروِ شبستان کے اور زیادہ قریب ہونے کا یقین دلاتے اور وہ یقین کر لیتا۔آخر ایک مرتبہ اس کی آنکھ کھلی تو ایک نئے نوجوان شخص کے پاس تھا۔ یہ شخص حریرِ سفید کے کپڑے پہنے تھا جس پر سنہرا کام تھا۔اُس کے سر پر نہایت ہی بیش قیمت تاج تھا اور اُس میں اعلیٰ درجے کے جواہرات لگے ہوئے تھے۔حسین کی آنکھ جیسے ہی اُس خوبصورت نوجوان کے سامنے کھلی جو شاہانہ لباس پہنے اور مُرصّع تاج سر پر رکھے ہوئے تھا، وہ نہایت ہی التجا و عاجزی کے لہجے میں کہنے لگا ''اُمیدوار کو انتظار نے بے صبر کر دیا ہے۔''

شخص: اے جسمِ خاکی! تو مراحلِ تحیّر کو طے کر چکا تجھے نہیں خبر کہ تو آسمان کے قریب اور فردوسِ بریں کے دروازے پر ہے۔اَب نہ گھبرا۔ملائکہ مُقرّبین تیرے انتظار میں ہیں اور حوریں تیرے لیے بناؤ سنگھار کر رہی ہیں۔

حُسین: اور آپ کون ہیں؟

شخص: میں وہ برزخ ہوں جو لاہوت و ناسُوت میں واسطہ ہے۔یہی میرا جسم ہے جو کبھی طُور بن کے سینے پر چمکا تھا۔یہی وہ نور ہے جو مسیح علیہ السّلام کے جسم سے خدا کی شان دکھاتا تھا اور مردوں میں زندگی کا چراغ روشن کر دیتا تھا۔ یہی وہ نور ہے جو اشراقِ مجّرد کی شان سے رسولِ آخر الزماں ﷺ کے سینے میں چمکا۔اور یہی وہ نور ہے جو امامت کے مشعل روشن کر کے معصوم جسدوں کو بدلتا ہے۔

حُسین: تو آپ جبرئیل ہیں؟

شخص: جبرئیل میرے تنوعات کی ایک چھوٹی سی شمع ہے۔

حسین: شاید آپ وحیِ لایموت ہیں؟

شخص: وحیِ لایموت نہیں، حیِّ لا یموت، مگر اس تشخیص کے ساتھ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ گو یہ ضرور کہوں گا اَنا خالقُ الاَرواحِ، اَنا خالقُ الاصباحِ۔ لیکن اس وقت تو ایک پیکرِ متحّیر میں ہوں اور وہ امام بن کر نمودار ہوا ہوں جس پر ایمان لانا ہر مکلّف کا فرض ہے۔

حسین: (ہاتھ سے ہاتھ ملا کے) تو میں بھی آپ کی امامت کے لیے اِس مظہرِ نقطہء وحدت کے ہاتھ پر بیعت کروں؟

شخص: حسین، سُن۔ تو منزلِ مقصود کو پہنچ گیا، مدارج صعود طے ہو گئے اور عنقریب تو اُس پُرشوق آغوش میں ہو گا جو دو سال سے تیرے لیے کُھلی ہے۔ اگر چہ اب کوئی عبادتِ دنیاوی تجھ پر فرض نہیں تاہم ارضی کثافت کا باقی ماندہ اثر دل سے نکال ڈالنے کے لیے ضرور ہے کہ اس سرِ وشبستان کے پھاٹک پر تین دن تک بیٹھ کے تو ایک مختصر سی عبادت کرے۔ تین شبانہ روز تیری زبان سے نکلتا رہے کہ مرکو الشو راغر قُنی فی بحرِ اَنوارِک۔ مگر شرط یہ ہے کہ چاہے کچھ کھا لے مگر ان تین دن میں پانی کا کوئی قطرہ تیرے حلق سے نہ اُترے۔

اتنا کہہ کر یہ تاجدار شخص تین روٹیاں چھوڑ کے چلا گیا اور اُس کے جاتے ہی مکان کے سب دروازے یکا یک اور ایک ساتھ بند ہو گئے۔ پہلے تو یہ اپنی تنہائی کی حالت دیکھ کر گھبرایا مگر فوراً اُس آخری مُرشد و امام کی نصیحت یاد آئی اور ریاضت اور وظیفہ میں مشغول ہو گیا۔ علی الاّ تصال ایک ہی جملہ کہتے رہنے اور پھر پانی نہ پینے کا یہ نتیجہ تھا کہ تیسرے روز پیاس نے مجنون بنا دیا تھا۔ ہونٹوں سے لے کے سینے تک سارا گلا خشک تھا اور سوائے سائیں سائیں کے اور کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ مگر زمّرد کے شوق میں وظیفے سے زبان بند نہ ہوئی اور اسی استقلال اور خود فراموشی سے دُعا پڑھتا جاتا

تھا۔

تیسرے روز حسین زبانِ حال سے العطش پکار رہا تھا کہ وہ تاجدار نوجوان شاہانہ لباس پہنے ہوئے آیا اور کہا ''لے اب سفرِ جنت کے لیے تیار ہو۔ تیری ریاضت پوری ہوئی ۔تو نے سب مراحل یقینی طے کر لیے اور کوئی چیز باقی نہ رہی جو اس راہ میں تیری مزاحم ہو۔ مگر تو پیاسا ہے ۔ ذرا اپنے آپ کو تازہ دم کر لے۔''

اس شخص کی زبان سے یہ جملہ پوری طرح نکل نہ پایا تھا کہ ایک حسین و نازنین عورت ایک سونے کا مُرصّع جام ہاتھ میں لیے، جو ایک خاص قسم کے لطیف و خوش رنگ شربت سے لبا لب تھا، حاضر ہوئی۔ اس شخص نے جام کو حسینہ کے ہاتھ سے لے کے حسین کی طرف بڑھایا اور کہا:

''لے، یہ شرابِ طہُور ہے جس کے دَور فردوسِ بریں میں ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔ اِس کے پینے سے تیری پیاس، ماندگی، تھکن اور جُملہ بدمزگیاں جاتی رہیں گی اور تو ایک نہایت ہی نورانی اور رُوحانی سُرور کے ساتھ جنت میں داخل ہو گا۔''

حسین نے فوراً جام لے کے منہ سے لگا لیا، اور پیاس کی ایسی شدت تھی کہ وہ دو ہی گھونٹ میں اُتار گیا۔ ایک لحظہ گزرا ہو گا کہ اُسے سر میں گرانی سی محسوس ہونے لگی جس کے ساتھ ہی خمار آلود آنکھیں جھپک جھپک کے بند ہو گئیں۔ وہ بے ہوش تھا، اور بے ہوشی بھی ایسی کہ سر و پا کی خبر نہ تھی۔

چوتھا باب

فردوسِ بریں

حسین کو خبر نہیں کہ یہ غفلت کتنی دیر تک اس پر طاری رہی۔ لیکن مدہوشی تھوڑی کم ہوئی تھی اور نشہ اُترنا شروع ہوا تھا کہ ایک نہایت ہی دل کش اور وجد آور نغمے کی آواز کان میں آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا دل فریب و دل رُبا پری پیکروں کا ایک طائفہ عجیب و غریب اور انتہا سے زیادہ پُر لطف باجوں اور مزامیر کے ساتھ اپنے نور کے گلوں سے ولولہ خیز بہار کی مسّرت انگیز دھن میں یہ ترانہ مبارکباد گا رہا ہے کہ "سلام علیکم طبتم فادخلو ہا خالدین۔" ایک جوشِ مسّرت کی بے اختیاری سے اُس نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ ہر طرف ایسا سماں نظر آیا کہ جدھر نظر جاتی ہے:

کرشمہ دامنِ دِل می کشد کہ جا ایں جا ست

حسین نے اُس وقت اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ ایک طلا کار اور مُرصّع کشتی میں سوار ہے اور نازک بدن اور پری جمال لڑکوں کی کوشش سے وہ کشتی ایک پتلی مگر بہت ہی دلکش نہر کے کنارے ابھی ابھی آ کے ٹھہری ہے۔ نرم اور نظر فریب سبزے کو شفّاف اور پاک و صاف پانی اپنی روانی میں چومتا ہوا نکل جاتا ہے۔ بعض مقامات پر گنجان اور سایہ دار درخت ہیں جو پیچیدہ اور خمدار زلفوں کی طرح نہر کی گوری مگر نم آلود پیشانی پر دونوں طرف جھکے پڑتے ہیں۔ مگر جہاں پر کشتی کنارے لگی ہے، وہاں ایک کشادہ مرغزار ہے۔ ان خوبصورت ملّاحوں کے کہنے کے بموجب وہ کشتی سے اُتر کے سبزۂ روئیدہ کی سیر کرنے لگا۔ وہاں جا کر دیکھا تو اور حیرت ہوئی۔ پانی کے پاس ہی سبزے کا ایک پتلا اور برابر حاشیہ چھوڑ کے شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو نہر کے دونوں طرف حدِّ نظر تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ اگر چہ پھولوں میں شادابی و خوش رنگی کی وہی شان ہے جو خودرو

پھولوں میں نظر آتی ہے مگر اس قُدرتی اجتہاد کے ساتھ خوش رنگی، لیاقت بلکہ بظاہر فوق العادت ہو شیاری و دانائی سے چمن بندی کی گئی ہے۔ چمنوں کی بعض قطاریں تو ایسی ہیں جن میں ایک ہی قسم کے اور ایک ہی رنگ کے پھول ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک ہی قوم اور ایک ہی وردی کی فوج مختلف کیمپوں پر تقسیم ہوتی چلی گئی ہے۔ مگر اکثر چمن ہیں جن میں مختلف رنگ کے پھولوں کو ترکیب دے کر زمین پر ایسی گل کاریاں کی گئی ہیں کہ عقلِ انسانی حیرت میں آ جاتی ہے۔ سارا مرغزار اور ساری وادی جو کوسوں دور تک پھیلی ہوئی ہے اور جیسے خُوبصورت متوازی اور سر سبز و شاداب پہاڑوں نے اپنے حلقے میں لے لیا ہے، ان چمنوں اور پھولوں سے بھری ہے اور مختلف نہریں جو پانی کی چادریں بن بن کے پہاڑوں سے اُترتی ہیں، ان ہی چمنوں اور پھولوں کو درمیان جا بجا بہہ رہی ہیں اور ان کے پانی نے خواہ پھولوں کی خوشبو سے متاثر ہو کے کسی اور وجہ سے گلاب اور کیوڑے کی شان پیدا کر لی ہے۔

یہ نہریں زبانِ حال سے پکار پکار کے کہہ رہی ہیں کہ ہم ہی تسنیم و سلسبیل ہیں۔ راستوں اور روشوں کی ترتیب میں معجزہ نما کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ ہر چمن کے ایک پہلو کو نہر دھوتی ہے تو اس کے دوسرے پہلو کو ایک چھوٹی سی خوشنما سڑک اپنی آغوش میں لیتی ہے۔ یہ سڑک چمن سے بھی زیادہ کمالِ صناعی دکھا رہی ہے۔ مختلف قسم اور مختلف رنگ کے سنگ ریزے بچھا کے کوئی سڑک فیروزے کی کوئی یاقوت کی اور کوئی نیلم کی بنا دی گئی ہے۔ پھر ترتیب میں یہ لُطف ہے کہ جس رنگ کے پھولوں کا چمن ہے، اُسی کی مناسب و موزوں رنگ کی نیلی خوش نما سڑک اُس کے پہلو سے گزری ہے۔ نغمہ سنج طیوران چمنوں میں اُڑتے پھرتے ہیں، پھولوں کے قریب بیٹھ بیٹھ کے عشق و محبت کی داستان سُناتے ہیں اور خدا جانے کس کمالِ اُستادی سے تعلیم دی گئی ہے کہ اکثر جانے والے جہاں

دیگر اطراف میں پری پیکروں کے نورانی گلوں سے خیر مقدم کا ترانہ سُنتے ہیں، وہاں اِن نغمہ سنج طائروں کا ساز بھی اپنے قدرتی ارغنوں سے یہی کلمہٗ خیر مقدم سُناتا ہے کہ ''سَلامٌ عَلَیکُم طِبْتُم فَادْ خُلُوہا خالِدِین۔''

حسین نے نہایت حیرت و جوش سے دیکھا کہ اِن چمنوں میں جا بجا نہروں کے کنارے سونے چاندی کے تخت بچھے ہیں جن پر ریشمی پھولدار کپڑوں کا فرش ہے۔ لوگ پُر تکلّف گاؤ تکیوں سے پیٹھ لگائے دلفریب اور ہوش ربا کم سن لڑکوں کو پہلو میں لیے بیٹھے ہیں اور جنت کی بے فکریوں سے لُطف اٹھا رہے ہیں۔ خوبصورت آفتِ روز گار لڑکے کہیں تو سامنے دست بستہ کھڑے ہیں اور کہیں نہایت ہی نزاکت اور دلفریب حرکتوں سے ساقی گری کرتے ہیں۔ شراب کے دور چل رہے ہیں اور گزک کے لیے سدھائے یا قدرت کے سکھائے ہوئے طیور پھولدار درختوں سے پھل توڑ توڑ کے لاتے ہیں اور ان کے سامنے رکھ کے اُڑ جاتے ہیں۔ پھل ہی نہیں، یہ خوشنما طیوُر کپڑوں میں لپٹے ہوئے کبابوں کی پوٹلیاں بھی لاتے ہیں اور ان کے لیے میکشی اور شاہد پرستی کا پورا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ حسین چیز جس نے حسین کو متوجہ کیا وہ یہ تھی کہ سب لوگ بے غل وغش نہایت بے فکری اور اطمینان سے ان لذتوں کے مزے لوٹ رہے تھے اور خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ پاس سے کون گذرتا ہے اور انہیں کس نظر سے دیکھتا ہے۔ نہ کسی کو کسی سے حسد تھا اور نہ کسی کو کسی لُطف کے چھپانے کی ضرورت تھی:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

کسے را با کسے کارے نباشد

یہ عالم دیکھ کے حسین کے دل میں ایک جوش و ولولہ پیدا ہوا۔ اس نے کسی قدر بلند آواز سے کہا''

بے شک فردوسِ بریں یہی ہے! یہیں آ کے نیکو کاروں اور ایمان داروں کو اپنے اعمالِ نیک کا صلہ ملتا ہے۔ مگر افسوس! اے زمّرد! تو کہاں؟'' یہ جملہ ناتمام ہی تھا کہ پاس کے چمن کے پھولوں کے نیچے سے ایک شیریں و دل کش آواز سے کسی نے کہا ''تو ابھی جنت کے چمنوں ہی کو دیکھ رہا ہے۔ ذرا محلوں اور قصروں کو بھی نظر اُٹھا کے دیکھ۔''

اُس نے یہ آواز سنی ہی تھی کہ سامنے سے ایک نہایت ہی نازک اندام اور قیامت خیز نازنین نے گلے میں باہیں ڈال دیں اور مسکرا کے کہا ''میں بھی تیرے لیے ہوں۔'' حسین ذرا جھک کر اس سے علیحدہ ہوا۔ غور سے اس کی صورت دیکھ کر کہا ''مگر میں پیاری زمّرد کے سوا کسی کو نہیں چاہتا''۔

نازنین: وہ بھی مل جائے گی۔ آپ کی خوشی کا پیمانہ تنگ ہے۔ ذرا ان سروری مسّرتوں سے نگاہ اور دل آشنا ہو لیں تو ان سے ملیے گا۔ دیکھیے جو سامنے موتی کا قصر ہے، وہ آپ ہی کے لیے ہے اور زمّرد اسی میں ہے۔''

حسین نے نظر اُٹھا کے اس رفیع الشان قصر کو دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی نظر دیگر عمارتوں پر بھی جا پڑی۔ اُسے نظر آیا کہ یہ عمارتیں باغوں سے بھی زیادہ مسّرت انگیز ہیں۔ بعض بالکل سونے کی، بعض مونگے کی اور بعض موتیوں کی نظر آتی ہیں۔ تمام مکانات جو حسبِ حیثیت محل، قصر اور کوشک کے لفظ سے تعبیر کیے جا سکتے ہیں، مذکورہ اشیا کے علاوہ ان ہی میں کوئی فیروزے کا کوئی زمّرد کا کوئی یاقوت کا اور کوئی ہیرے کا ہے۔ موتی کے محل جن میں سے ایک حسین کے لیے ہے، ایسے آب دار رنگ میں رنگے ہوئے ہیں کہ نیچے سے اُوپر تک ایک ہی موتی میں ترشے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں جا بجا صدفِ صادق کے جھلکتے ہوئے ٹکڑے جڑے ہیں۔ تمام محلوں پر علاوہ اس رنگ کے جس طرف وہ محل منسوب ہیں۔ ہر در و دیوار کے گرد بلور اور شیشے کے ٹکڑوں

کا حاشیہ بنا ہوا ہے اور ان شیشوں کے نیچے ڈاک دی ہوئی ہے۔ یہ آئینے دن کو آفتاب کی اور رات کو ہزارہا کافوری شمعوں کی روشنی میں اس قدر جگمگا اُٹھتے ہیں کہ تیز سے تیز نگاہ چُندھیا نے لگتی ہے ۔اس کے علاوہ ان دیواروں میں اندر باہر جواہرات جڑے ہیں جو اپنی کرنیں چمکا چمکا کے ایک عجیب لُطف پیدا کرتے ہیں۔ بہر تقدیر اس مجموعی سامان، سنہری روپہلے اور رنگ برنگ کے قصروں ،ان کے آئینوں اور جواہرات نے ہر چہار طرف ایک ایسی کیفیت بنا رکھی ہے کہ نظر پڑتے ہی انسان کے دل میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔

حسین ان محلوں کو دیکھ کر ذرا مبہوت کھڑا رہا مگر ہوش کے آتے ہی اس خاص محل کی طرف متوجہ ہو اجس کی نسبت اس پری پیکر کی زبان سے سنا تھا کہ خاص اس کے لیے ہے اور جس میں پیاری زمّرد کے ملنے کی اُمید تھی۔ اس نے کسی چیز کی طرف نظر اُٹھائی نہ کسی سامانِ عشرت کو دیکھا اور سیدھا اس قصر کے دروازے پر جا پہنچا۔ زمّرد استقبال کے لیے محل سے باہر نکل آئی تھی۔ وہ ایک غیر معمولی مگر نہایت دلربا وضع سے بال کھولے اور زلفوں کو شانوں اور پیٹھ پر بکھیرے کھڑی تھی۔ آنکھیں دو چار ہوئی تھیں کہ بے اختیاری کے جوش میں دونوں کی زبانوں سے ایک دوسرے کا نام نکلا اور وہ دوڑ کے لپٹ گئے۔ حسین تو حسرت میں تھا ہی، زمّرد کے چہرے سے بھی ایک غیر معمولی مسّرت و جوش دیکھ کر بے اختیار ہو کے رونے لگا۔ اس کی سانس سے رونے کا پتا پا کے زمّرد نے اپنے آپ کو علیحدہ کیا اور کہا:

''حسین! یہاں رونا حرام ہے۔ پس آنسو پونچھ ڈالو۔''

'حسین: (آنسوؤں کو پونچھ کے) زمّرد، یہی فردوسِ بریں ہے؟''

زمُّرد: یہی۔

حسین: تم یہاں چلی آئیں اور مجھے اُس درد والم میں چھوڑ دیا۔

زمّرد: یہ تو میرے اختیار کی بات نہ تھی۔ مجھے تو ایک اتفاقی شہادت نے یہاں پہنچایا ہے۔ مگر تمھاری زندگی باقی تھی، اور ضرور تھا کہ اتنے مدارج و مراحل طے کر کے یہاں آؤ۔ مگر اس جنت میں بھی تم کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ کیا کہوں، کس قدر دشواریوں سے مجھے اتنی اجازت ملی ہے کہ تمھیں اپنے پاس آنے کا راستہ اور طریقہ بتاؤں۔

حسین: میرے تو ایسے اعمال تھے کہ شاید مرنے کے بعد بھی یہاں نہ پہنچ سکتا۔ صرف تمھاری محبت تھی جو خضرِ طریقت بن کے لائی۔

زمّرد: میری محبت؟

حسین: ہاں، تمھاری محبت۔

زمّرد: لیکن اگر تمھارے دل میں طلبِ صادق نہ ہوتی تو میں کیا کرسکتی تھی؟

حسین: مگر اس طلب سے تھوڑا ہی ممکن تھا کہ اس ملاءِ اعلیٰ میں آ پہنچتا۔ میں تو دل میں ٹھان چکا تھا کہ اُس قبر کے پاس اور اُس چٹان کے سامنے جس پر تمھارا نام کندہ ہے، پڑے پڑے دم توڑ دوں گا۔

زمّرد: خیر، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی اب اندر چل کے آرام سے بیٹھو۔ شرابِ طہور کے دو جام پیو اور دیکھو اس خداوند جلّ وعلیٰ نے تمھارے لیے کیسے کیسے سامانِ راحت اور کیسی کیسی لذّتیں فرہم کر رکھی ہیں۔ (یہ کہہ کر زمّرد حسین کو اندر لے گئی۔) جس وقت حسین نہر کے کنارے کشتی سے اُترا ہے، سرِ شام کا وقت تھا۔ مگر اب رات ہوگئی تھی۔ ہر طرف کافوری شمعیں روشن ہوئیں۔ ایک خاص قسم کی ٹھنڈی روشنی جس کا پتا نہ چلتا تھا کہ کہاں سے آتی ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے دروازوں اور

بند کھڑکیوں اور چھت کے روشندانوں سے رہ رہ کے چمک اُٹھتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا یکا یک ہزار مہتابیاں چھوڑ دی گئیں۔ اس تیز روشنی میں شمعیں ماند پڑ جاتی تھیں اور سارے ہم صحبتوں کا چہرہ ایک دوسرے کو پیارا اور دلفریب نظر آنے لگتا تھا۔ اس غیبی روشنی کو حسین نے حیرت سے دیکھا اور دریافت کیا کہ یہ کیسی روشنی ہے؟ وہ بار بار دروازے سے باہر جھانک کے دیکھتا مگر کچھ حال نہ کُھلا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ اس روشنی کا مرکز و منبع اِرد گرِد کی پہاڑیوں کی چوٹی پر ہے جہاں وہ زیادہ چمکتی ہے اور وہیں سے اس کی کرنیں آ کے تمام مکانات کو روشن کر دیتی ہیں۔ ایک یہ بات اس نے دیکھی کہ جب روشنی پوری اور کمال پر آ جاتی تو چاروں طرف سے لوگ چلاّ اُٹھتے ہیں "ھٰذَا الَّذِ ی وَعَدَ نِی رَبّی۔ سب کے ساتھ ایک بے اختیاری کے جوش میں یہی کلمہ خود حسین کی زبان سے بھی کئی مرتبہ نکل گیا۔ جب اس روشنی کا راز حسین کے لیے حل نہ ہو سکا تو اس نے زمّرد سے پوچھا "یہ کیسی روشنی ہے؟"

زمّرد: تم نے نہیں پہچانا؟ یہی وہ نوُرِ الٰہی ہے جو موسیٰ کو وادی ایمن میں نظر آیا تھا۔ تم نے قرآن و حدیث میں پڑھا ہے کہ جنت میں خدا کا دیدار ہوگا۔ اس سے یہی نور عبارت ہے۔

حسین: تو یہی خداوندِ جلّ وعلیٰ ہے؟

زمّرد: یہ تو نہیں کہہ سکتی مگر ہاں۔ اس کے تنوعِ اُولیٰ کی سب سے زیادہ مکمل اور سچّی تصویر یہی ہے۔ یہ جواب سن کر حسین اس نوُر کے سامنے سجدے میں گر پڑا مگر زمّرد نے اُٹھایا اور کہا "یہاں عبادت کی تکلیف نہیں۔ یہ نور صرف اس غرض سے ہے کہ لوگوں کے دل میں اطمینان کی مسّرت پیدا ہو۔"

اب حسین نے مکان کے فرش اور تمام سامان کو دیکھا، اور اسے یقین ہوگیا کہ یہ سب نوری سامان

ہے جو دنیا میں نہ کبھی انسان کے دل میں گزرا ہے نہ کسی کے قیاس وگمان میں آ سکتا ہے۔ زمّرد اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیے یہاں کی عجوبہ چیزیں دکھاتی پھرتی تھی اور حسین ہر چیز پر خدائے ذوالجلال والاکرام کی قدرت ورحمت کا جوش وخروش سے اعتراف کرتا تھا۔ آخر پھرتے پھرتے ایک مقام پر رُک گیا اور نہایت گرم جوشی کے ساتھ زمّرد سے لپٹ گیا اور کہا ''یہ سب لُطف اور سارے سامان عیش کے ہیں۔ مگر زمّرد! میرے لیے کوئی تجھ سے بڑی نعمت نہیں ہو سکتی۔''

زمّرد: یہی محبت تمھیں یہاں لائی ہے، ورنہ یہ وہ مقام ہے جہاں کسی زندہ انسان کا بہت کم گزر ہوتا ہے۔ یہ تمھاری بڑی فضیلت ہے کہ اس جسمِ خاکی کے ساتھ اس نورستان میں آ پہنچے۔ حسین کو جنت میں پھرتے اور زمّرد کے حُسن و جمال سے لُطف اُٹھاتے پورا ایک ہفتہ گزر گیا ہو گا۔ اور یہ ہفتہ اس حالت میں گزرا کہ دل کش اور نشاط انگیز نغموں کی آواز پُر اثر کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔ بہت سی حوریں اس کی خدمت کو حاضر تھیں اور سب پری جمال وزاہد فریب تھیں۔ مگر اسے زمّرد کے سوا کسی سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ ہر وقت زمّرد کی بغل میں ہاتھ رہتا اور دونوں ہمیشہ فرحت بخش وادیوں اور روح افزا مرغزاروں میں ٹہلتے رہتے۔ زمّرد نے اتنے زمانے میں پھر پھر کے اسے یہاں کی تمام نزہت گاہیں اور سب عجائبات دکھا دیے۔ ایک مرتبہ حسین نے کہا ''زمّرد! میں سنتا تھا کہ جنت میں ہمیشہ صبح کا وقت ہوتا ہے مگر آ کے دیکھا تو یہاں بھی دنیا ہی کے سے تغّیرات موجود ہیں۔''

زمّرد: اس امر میں لوگوں کو سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں ہر وقت صبح ہی رہتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور کسی وقت کا لُطف انسان یہاں اٹھا سکتا ہی نہیں۔ ایسا ہو تو جنت سے ایک بڑا لُطف اُٹھ جائے۔ اصل مطلب یہ ہے کہ یہاں ہر وقت کوئی ایسا مقام ضرور مل جائے گا جہاں

انسان جس وقت کا چاہے، لُطف اُٹھائے۔

حُسین: کیونکر؟

زمّرد: زبان سے کہنے کی نہیں۔ میں چل کے تمھیں آنکھوں سے دکھائے دیتی ہوں۔

یہ کہہ کے زمّرد اُسے لیے ہوئے محل سے باہر نکلی اور کہا ''دیکھو! یہاں دوپہر کا سماں ہے۔ اب آگے چلو۔'' تھوڑی دیر بعد دونوں ایک ایسے درختوں سے گھرے ہوئے سبزہ زار میں پہنچے جہاں آفتاب کی روشنی کو درخت روکے ہوئے تھے، ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور مشرقی قلّہ ہائے کوہ سے ہلکی ہلکی روشنی نمودار تھی۔ زمّرد یہاں پہنچ کے بولی ''دیکھو: یہ صبح کا وقت ہے۔''

حُسین: بے شک، ہے۔

زمّرد: آگے چلو۔

یہاں سے روانہ ہو کے تھوڑی دیر میں دونوں ایک ایسی چھوٹی سی وادی میں پہنچے جو ہر طرف سے پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں بھی درختوں نے خفیف تاریکی پیدا کر دی تھی اور ذرا فاصلے کے مقامات پر ہلکا دُھواں اُٹھتا نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں طیور کے چہچہانے کا شور بلند تھا اور مغرب کے قلّے پر آفتاب کے غروب ہونے کی بھی شعاعیں نظر آ رہی تھیں۔ زمّرد نے یہاں رُک کے کہا ''اور یہ شام ہوئی۔''

حُسین: اس میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔

زمّرد: دن کا سماں دیکھ چکے اور شام بھی دیکھ لی۔ صرف رات کا وقت باقی ہے۔ چلو، وہ بھی دکھائے دیتی ہوں۔ یہاں سے واپس آ کے زمّرد حسین کو لیے ہوئے ایک پہاڑ کے غار میں داخل ہوئی جہاں نہایت خوبی سے ایک نشیبی راستہ بنا ہوا تھا۔ زینے نہ تھے بلکہ زمین جو پختہ سطح اور رنگ

برنگ کی تھی، ساعت بساعت نیچی ہوتی جاتی تھی۔ اس زمین دوز راستے میں جاتے جاتے دونوں ایک نہایت ہی عالیشان اور پُر لُطف جگہ میں پہنچے، جہاں ہر جگہ کافوری شمعیں روشن تھیں، جھاڑ اور فانوس کثرت سے لٹک رہے تھے اور درو دیوار اور شیشے کے رنگ برنگ ٹکڑوں کو ان شمعوں کی شاخیں کچھ ایسی عجیب روشنی سے چمکا رہی تھیں کہ نظر خیرہ ہو جاتی تھی۔

زمّرد: دیکھو! یہ رات ہے، اور کیسی پیاری رات!

حُسین: پیاری زمّرد! اگر تو ساتھ ہو تو ہر چیز پیاری ہے۔

یہ سب سامان دیکھ کے دونوں اپنے قصر میں واپس آئے اور باہم عشق و محبت کی باتیں کرنے لگے۔ مگر پہلے زمّرد اب کسی قدر افسردہ تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ زبردستی کوشش کر کے چہرے کو بشاش بناتی ہے مگر دل اندر سے بیٹھا جاتا ہے۔ حسین نے اس امر کو حیرت سے دیکھا اور کہا ’’زمّرد! اس فردوس بریں میں آج تم مجھے ملُول نظر آتی ہو؟‘‘

زمّرد: نہیں۔ مگر ہاں، گزشتہ مفارقت کسی کسی وقت یاد آ جاتی ہے تو خواہ مخواہ دل بھر آتا ہے۔

حُسین: مگر خدا نے وہ مصیبت کاٹ دی ہے اور اب اُمید ہے کہ ہم دونوں ہمیشہ یوں ہی ایک دوسرے کے وصل سے حظ اُٹھاتے رہیں گے۔

زمّرد: خدا کرے ایسا ہو۔ مگر حسین، مجھے اس کی اُمید نہیں۔

حُسین: (حیرت سے) اُمید نہیں؟ حیف ہے! یہاں کے لُطف تو سرمدی و ابدی ہیں۔ یہاں نہ کسی دشمن کا اندیشہ ہو سکتا ہے، نہ کسی حاسِد کے حسد کا۔ پھر نا اُمیدی و حسرت نصیبی کا کیا سبب؟ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ‘‘۔

زمّرد: بے شک۔ مگر تم یہاں قبل از وقت آئے ہو اور ابدی و سرمدی لُطف اُٹھانے کے لیے وہی

لوگ آتے ہیں جو مرنے کے بعد دنیا سے قطع تعلّق کر کے آئیں گے۔ تم نے ابھی اس مادّی دنیا کے علائق قطع نہیں کیے اور اس مادّی جسم کو ساتھ لائے ہو جس کو وہیں دنیا میں چھوڑنے کے لیے تمھیں ایک روز اُس عالم میں جانا ضرور ہے۔ دیکھو! حضرت مسیحؑ یہاں زندہ آئے اور اب تک ہیں۔ مگر انہیں کبھی کسی لُطف میں پورا مزہ نہیں آتا۔ اس لیے کہ جانتے ہیں کہ یہ قفسِ عنصری چھوڑنے کے لیے ایک مرتبہ پھر جانا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کثافتِ مادّہ اس نورستان میں نہیں۔

حُسین: افسوس! پھر کب جاؤں گا؟

زمّرد: جب حکم ہو جائے۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلدی جانا پڑے گا۔ اس لیے کہ وہاں کی شدید ضرورتیں تمھیں بُلا رہی ہیں۔

حسین یہ سُن کے آبدیدہ ہو گیا اور نہایت جوشِ دل سے ایک آہ سرد بھر کر بولا:

رُوئے گُل سیر ندیدیم و بہار آخر شُد

مجھے تو ابھی تیرے وصال کا لُطف بھی نہیں حاصل ہوا۔ مگر زمّرد! مجھ سے تو اب نہ جایا جائے گا۔ اس وقت سے میں ہر وقت تیرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے رہوں گا تاکہ کوئی مجھے تجھ سے جدا نہ کرے۔''

یہ سُن کے زمّرد بھی آبدیدہ ہو گئی اور بولی ''حسین! یہ امر تمھارے اختیار سے باہر ہے۔ جب وقت آئے گا تمھیں خبر بھی نہ ہو گی اور ادنیٰ غنودگی تمھیں اُس عالم میں پہنچا دے گی۔''

حُسین: (رو کر) تو پھر تو مجھ سے تمھارے فراق کی مصیبت نہ برداشت کی جائے گی۔ جاتے ہی اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالوں گا، اور تم سے چھوٹے ایک گھڑی بھی نہ گزری ہو گی کہ پھر تمھارے پاس پہنچوں گا۔

زمّرد: کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ خودکشی کر لی تو جنت تم پر حرام ہو جائے گی۔ پھر تو قیامت تک

بھی ملنے کی اُمید نہیں۔

حُسین: (زور سے سینے پر ہاتھ دھر کے) ہائے! مجھ سے کیوں کر زندہ رہا جائے گا؟ خدا کے لیے کوئی تدبیر بتاؤ۔ ورنہ سمجھ لو کہ ہمیشہ کے لیے مایوسی ہے۔ اس لیے کے اب دنیا میں جا کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہزار روکو، میرا خنجر میرے سینے پر اُٹھ ہی جائے گا۔ اچھا اگر یہ نہیں تو تم میرے ساتھ چلو۔

زمّرد: یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ میں اپنے بس میں ہوں۔ اتنا ہی لفظ زبان سے نکلا تھا کہ کانپنے لگی اور اُٹھ کے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی سُن تو نہیں رہا ہے مگر جب کوئی نظر نہ آیا تو اطمینان سے آ کر بیٹھ گئی اور بولی ''حسین، اب اِن باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمھارے واپس جانے کا وقت آ گیا ہے۔

حُسین: (بے صبری سے چلّا کے) کیا؟ ابھی سے؟ نہیں، میں ابھی نہ جاؤں گا۔'' یہ کہہ کے زمّرد کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر پکڑ لیا۔

زمّرد: ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ جتنی زیادہ بے صبری دکھاؤ گے، اتنے ہی زیادہ خراب ہو گے۔ اِس وقت تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اِسے غنیمت سمجھو اور جو میں کہتی ہوں سنو! کوئی آ گیا تو یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ عمر بھر کفِ افسوس ملو گے۔ ساری دنیا میں بھٹکتے پھرو گے اور مطلب نہ نکلے گا۔

حُسین: (اپنے آپ کو سنبھال کر) اچھا سُنتا ہوں۔ پیاری زمّرد، تم ہی کوئی تدبیر بتاؤ تو کام چلے گا (یہ جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ جی بھر آیا اور زار و قطار رونے لگا۔)

زمّرد: (اپنے نازک ہاتھ سے منہ بند کر کے) کیا غضب کرتے ہو! خدا کے لیے سنبھلو۔ دنیا میں

جا کے جی بھر کے رولینا۔ مگر ابھی میری ایک بات ذرا ہوش وحواس درست کر کے سُن لو۔

حسین: (نہ رُکنے والے جوش کو روک کے) کہو، پیاری زمّرد! دل وجان سے سُن رہا ہوں۔

زمّرد: یہاں سے جانے کے بعد پہلے تم کوشش کرنا کہ وہی لوگ جن کی مدد سے اس دفعہ یہاں آئے انھی لوگوں کی اطاعت کر کے، انھیں خوش کر کے، پھر یہاں آنے کا موقع پاؤ۔ اپنی حاجت روائی کے لیے تم ان کے کسی حکم سے انحراف نہ کرنا اگر وہ تمھیں یہاں بھیجنے کا وعدہ نہ کریں اور سب طرف سے مایوس ہو جاؤ تو پھر اُس وادی میں آ کے ٹھہر جانا، جہاں میری قبر ہے اور جہاں خط بھیج کر میں نے تمھیں یہاں آنے کی تدبیر بتلائی تھی۔

حسین: کوہِ طالقان میں؟

زمّرد: ہاں، ہاں۔ وہیں۔ اگر تم ایک مہینے تک وہاں ٹھہرو گے تو پھر میں کوئی تدبیر بتاؤں گی۔ دیکھو! خبردار کسی کو خبر نہ ہو کہ میں نے وہاں بلُایا ہے۔

حسین: مگر پیاری زمّرد! وہ تدبیر اسی وقت بتا دو کہ یہاں سے جاتے ہی اس پر عمل درآمد شروع کر دوں۔

زمّرد: افسوس! تم نہیں سمجھ سکتے۔ بس تمھیں وہی کرنا چاہیے جو میں بتاتی ہوں۔ وہ تدبیر اس وقت بتانے کی نہیں۔

حسین: دیکھوں، اب کتنے دن ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔

زمّرد: صبر کرو اور ضبط سے کام لو۔ اور خبردار! ایسی کمزوری اور بزدلی نہ دکھانا کہ خودکشی کا ارادہ کرلو۔

حسین: میں اسی سے ڈرتا ہوں، پیاری زمّرد، تیرے عشق میں بعض وقت اپنے ہوش میں نہیں ہوتا ہوں اور نہ نیک وبد سمجھتا ہوں۔ یہ تیرے لیے ہی تھا کہ میں نے اپنے چچا اور شیخ الوقت امام نجم

الدین نیشاپوری کوقتل کرڈالا۔

زمّرد: میں جانتی ہوں، مگر اس میں مجھے شریک نہ کرو(کچھ آہٹ پا کے) اب خاموش رہو ۔ناگہاں چھ سات حوریں ناز و انداز سے قدم رکھتی ہوئی سامنے آئیں اور محبت کے لہجے میں حسین سے کہنے لگیں:

''اب چل کے باہر کی سیر کیجے اور ان نورانی تختوں پر جلوہ افروز ہوجیے جو چمنوں کے درمیان میں ہیں۔اِس وقت کی بہار دیکھنے کے قابل ہے۔شرابِ طہور کے جاموں میں خاص مزہ ہے۔''

حُسین: میں تو یہاں تنہا ہی اچھا ہوں۔

زمّرد: وہاں چلنے میں کیا مضائقہ ہے۔چلو، میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔

حُسین: خیر، اگر تمھاری یہی مرضی ہے تو مجھے کیا عذر ہوسکتا ہے۔اتنی دیر میں اور سب حُوریں بھی آ گئیں، اور زمّرد حسین کو ساتھ لیے قصرِ زمرّدی کے باہر نکلی۔سب کے سب لالہ زار کے درمیان میں طلائی تختوں پر جا کے بیٹھے۔تخت کے دونوں جانب دوحوض تھے اور بغیر کہے صرف واقعات سے یقین دلایا جاتا تھا کہ ایک حوضِ کوثر اور دوسرا شرابِ طہور کا ہے۔سامنے چند حُوریں بیٹھ کے عجب دلربا اور وجد میں لانے والی دھن میں گانے لگیں۔دو چار غلمان یعنی خُوبصورت کم عمر لڑکے سونے کے جام وصراحی لا کے کھڑے ہو گئے اور نغمہ وسرود کے ساتھ دور بھی چلنے لگا۔دو جاموں نے حسین پر از خود رفتگی کی کیفیت پیدا کر دی اور جب وہ اس عالمِ نور کو بے خودی کی نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، اُسے نظر آیا کہ زمّرد ایک ہاتھ تو اس کے گلے میں ڈالے ہوئے ہے اور دوسرے ہاتھ سے ایک چھلکتا ہوا جام اس کے منہ سے لگا رہی ہے۔حسین اس لُطفِ صحبت کا دل ہی دل میں مزہ اُٹھا کے اس جام کو پی گیا مگر پینے کے بعد معلوم ہوا جیسے زمّرد کی آنکھوں سے موتیوں کی طرح

آنسو ٹپک رہے تھے۔ بےخُودی کے جوش میں پیاری دل رُبا کی دل دہی کے لیے بڑھنے ہی کو تھا کہ مدہوش ہوکر گر پڑا۔ بس اِس کے بعد اُسے اپنے پرائے کی خبر نہ تھی۔

پانچواں باب

پھر وہی عالمِ عناصر

دیر کی آزار رساں غفلت و بے ہوشی کے بعد حسین ذرا ہوشیار ہونے لگا تھا کہ کان میں آواز آئی ''

اے جسم خاکی! اُٹھ اور اس برزخِ کبریٰ کا ہاتھ چوم جو تیرا امام ہے اور جس نے تیرے لیے باوجود مجردِ محض ہونے کی صورت ماد ی اختیار کر لی ہے۔ حسین نے بے ساختہ آنکھ کھول دی اور بجائے جنت یا زمرد کے پہلو کے اپنے آپ کو اس تاجدار شخص کے سامنے پایا جس کے ہاتھ پر اس نے بیعت کی تھی اور جو اس سفرِ جنت کی آخری منزل پر ملا تھا۔ حسین آنکھیں ملتا ہوا ادب سے اُٹھ بیٹھا اور اُس کے قدموں پر گر کر سر رگڑ کر کہنے لگا:

مکُن بیدار ازیں خوابم خُدا را!

شخص: نہیں۔ تجھے پھر عالمِ ارضی میں جانا ہے۔ میرا یہ ہاتھ جس میں نور کے ماد ے کا بہت کم جُزو ہے، تیرے ہاتھ سے مل چکا ہے اور ہمیشہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں رہتا ہے جن کے وسیلے سے تیری اُس ملاءِ اعلیٰ تک رسائی ہوئی۔

حسین: مگر میں ابھی چند روز اور جنت میں رہنے کا آرزومند ہوں۔

شخص: اِس ماد ی عالم کی زندگی میں ممکن نہیں کہ تو اُس روحانی عشرت کدے میں جا سکے۔ جا اور اس وقت کا منتظر رہ جب کسی ذیلی کوشش یا امامِ مرشد کے حکم سے تو جامِ فنا پیے گا۔

حسین: آپ میرے امام ہیں اور آپ ہی جامِ فنا پلا کے مجھے فردوسِ بریں میں پہنچا دیجیے۔

شخص: یہ ملاءِ اعلیٰ کی سرحد ہے اور یہاں فنا نہیں۔

اتنے میں وہی پہلی پری وش نازنین لبریز جام ہاتھ میں لیے ہوئے آئی، جس کے دیکھتے ہی اس

شخص نے کہا ''بس، اب زیادہ حجت نہ کر اور یہ شرابِ طہور کا آخری جام پی۔'' یہ کہہ کے اُس نے جام اپنے ہاتھ سے حسین کی طرف بڑھایا۔

حسین اب جانتا تھا کہ یہ شرابِ طہور دار وئے بے ہوشی کا اثر رکھتی ہے اور جس طرح اُس کا نشہ پہلے اُسے عالمِ نور میں لے گیا تھا، اب حضیضِ ظلمت میں لے جائے گا۔ مگر مایوسی کی تکلیف نے پیاس اس قدر تیز کر دی تھی کہ انکار کی جراُت نہ ہوئی۔ بے تکلّف لے کے پی گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھول کھول کے وہ مختلف سین دیکھنے لگا جو حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے تھے۔

آخر ایک شب کو اس کی آنکھ شیخ الجب کے سامنے کھلی۔ اس پہلے نگہبان نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کے کہا ''حسین! تو پھر اس تیرہ خاک دانِ عنصری کے حدود میں آ گیا اور ان آنکھوں سے جو انوارِ محضہ و مجّردہ دیکھ چکی ہیں، پھر نورِ سینا کو اسی طرح ستّر حجابوں میں دیکھ رہا ہے۔''

حسین: (آبدیدہ ہو کے) مگر میں تو اِس ظلمتِ خاکی میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

طورِ معنی: بے شک نہ چاہتا ہوگا۔ جذباتِ نورِ وحدت ایسی ہی کشش رکھتے ہیں مگر کیوں کر ممکن تھا کہ اِس جسمِ خاکی کا دھبّا اُس نورستان میں ہمیشہ قائم رہتا۔

حسین: تو للہ کوشش کیجیے کہ اسی وقت اِس جسمِ خاکی کو چھوڑ کے اُس سرِ وشبستانِ اعلیٰ کا راستہ لُوں۔

طورِ معنی: اِن اُمور میں شیخ علی وجودی ہی تمھارا اطمینان کر سکتے ہیں۔ اُن کے پاس جاؤ اور وہ جو کہیں، اُس پر عمل کرو۔

حسین: (جوشِ دل سے نوحہ وُ بکا کر کے) افسوس! میری اتنی ریاضت اور یہ مُدتوں کی آرزو

مندی صرف اتنے مختصر زمانے کے لیے تھی! آہ! کیا کروں کہ پھر زمرّد کا وصال نصیب ہو! یہ کہہ کر وہ پُھوٹ پُھوٹ کے اور زار وقطار رونے لگا اور یہاں تک رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔

طورِ معنی: اے بلند حوصلہ مُشتِ غبار! میرے عزلت کدے کو خالی کر اور صفحۂ ہستی پر جا کے اس معیادِ معیّنہ کو پورا کر، جتنے دنوں کے لیے تو اِس ظلمت کدۂ ارض میں گرفتار ہے۔

حُسین: کاش! یہ بھی معلوم ہوتا کہ اِس مُشتِ غبار کو کب تک اِس عالم میں سرگرداں پھرنا اور خاک اُڑانا ہے۔

طورِ معنی: تیرے لیے ان رموز کا ظاہر کرنا شیخ علی وجودی کا کام ہے۔ اس لیے وہی تیرے مُرشد ہیں۔ مگر ہاں، تجھے ایک راز بتا سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ پھر اُس عالمِ نور کی زیارت فقط اُس امام کے اختیار میں ہے جو لاہوت وناسوت کا برزخ اور تجلّی ہے۔ وہ تجلّی جو مختلف جسد ہائے امامت ونبوت میں ظاہر ہوتی رہی۔

حُسین: مگر اُن تک رسائی کیوں کر ہو سکتی ہے؟ اور ملاءِ اعلیٰ سے پھر میں اس قعرِ ظُلمت میں پھینک دیا گیا تو؟

طورِ معنی: گو اُن کا مرکزِ مقرر وہی نورستانِ اعلیٰ ہے مگر یک گونہ تعلّقاتِ مادہ جن کی وجہ سے انھوں نے بہت سے جسدِ ہائے امامت بدلے، انھیں اکثر اوقات اس آ خشیجستان میں کھینچ لاتے ہیں۔ مگر بغیر مُرشد کے اس غرض میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر تو اصرار کرے گا تو تیرے مرشد شیخ علی وجودی تیری اس امر میں مدد کریں گے۔ پس اب تو اس خلوت کدۂ نور کو خالی کر اور مُرشد کی قدم بوسی کے لیے روانہ ہو۔

اِس تقریر نے اُمید کا ایک دُھندلا چراغ اس کے سینے میں روشن کیا جس کی روشنی میں وہ غار سے

باہر نکلا۔ لیکن اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب دیکھا کہ کاظم جنوبی غار کے دہانے پر اسی وضع اور حالت میں کھڑا ہے جس وضع و حالت میں وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ کاظم جنوبی نے اس کی صورت دیکھتے ہی کہا: ''اب تو تم کو اطمینان ہو گیا کہ شجرِ معرفت کی ایک شاخ تم بھی ہو۔''

حسین: اور آپ یہاں کب آئے؟

کاظم جنوبی: ابھی تمھارے ساتھ ہی آیا ہوں۔

حسین: ابھی؟

کاظم جنوبی: ہاں، ابھی۔

حسین: مجھے تم سے رُخصت ہوئے کئی ہفتے گزر گئے۔

کاظم جنوبی: (ہنس کر) اِس عالم اور اُس عالم میں بڑا فرق ہے۔ یہاں کا ایک ایک دن وہاں کے ستّر برس کے برابر ہے۔

حسین: وہ ایک گھڑی سہی، مگر تم یہاں ٹھہرے کیوں رہے؟

کاظم جنوبی: امامِ قائم قیامت کا حکم یہی تھا۔

حسین: امامِ قائمِ قیامت کون؟

کاظم جنوبی: وہی جن کے ہاتھ پر اُس عالمِ نور کے سفر میں تم نے بیعت کی ہوگی۔

حسین: مگر ان کے احکام تم تک کیوں کر پہنچ گئے؟

کاظم جنوبی: انھی مُرشد کے ذریعے سے جو راہِ طریقت طے کرنے کے لیے میرے اور ان کے درمیان واسطہ ہیں۔

حسین: تو شاید تمھارے مُرشد یہاں آئے ہوں گے؟

کاظم جنوبی: اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ وہ ایک توجہ سے اپنے خیالات میرے دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔

حُسین: افسوس! میں جنت سے زبردستی کھینچ کے نکالا گیا۔

کاظم جنوبی: ان امورِ ربّانی کی شکایت نہ کرو۔ اوران کے مصالح دریافت کرنا ہیں تو اپنے مُرشد شیخ شریف علی وجودی کے پاس جاؤ۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ اب تم عالمِ نور کی سیر کر آئے ہو، لہٰذا ان کو اسی روحانی لقب سے یاد کرنا جو اس سروشبستان میں مشہور ہے۔

حُسین: کیا اُن کا کوئی اور بھی لقب ہے؟ میں نے سُنا نہیں۔

کاظم جنوبی: ہاں، اِس عالمِ عناصر میں تو ان کا نام یہی ہے جو تم جانتے ہو، مگر اس عالم نور میں وادیِ ایمن کہے جاتے ہیں۔

حُسین: (تعجب سے) وادیِ ایمن! (اور پھر سوچ کے) بے شک، انہیں وادیِ ایمن ہی کہنا چاہیے۔

انھی کے پہلو میں نور کی حقیقت کی پہلی شعاع نظر آئی۔

کاظم جنوبی: بس، اب چلو اور حلب کا ارادہ کرو۔

حُسین: مگر مجھے اتنا ضرور بتا دیجیے کہ اُس عالمِ نور میں کبھی پھر بھی میرا گُذر ہو سکے گا؟

کاظم جنوبی: اس امر میں کوئی شک نہیں کر سکتا۔ مگر ہاں، یقینی ہے کہ اگر تمھارے مُرشد کی توجہ ہو تو سب باتیں ممکن ہیں۔

کاظم جنوبی نے اس جُملے سے حسین کے سینے میں اُمید کے چراغ کو ذرا اور اُکسا دیا۔ آخر دونوں نے اُس وحشت ناک مسکن دام و در کو چھوڑا اور شہر اصفہان میں آئے۔ کاظم جنوبی نے اپنی مسجد

کے دروازے پر پہنچتے ہی آواز لگائی ''دہنِ سگ بہ لُقمہ دوختہ بہ'' جس کے بعد حسین نے اُسے رُخصت کیااور شہرِ حلب کی راہ لی۔

اِس سفر میں حسین ہر وقت جنت اوراس کی حوروں کی اُدھیڑ بُن میں رہتا۔اگر چہ اس کا جسم اِس دنیا میں تھا لیکن اُس کے خیالات اوراُس کے اعتقاد میں اُس کی روح علی الدّ وام اُس دوسرے عالمِ نور کے مزے لیتی رہتی۔وہ خیال میں کہتا ''اتنے انقلابات کے بعد اب مجھے تو یہ معلوم ہو گیا کہ

''مُوتُو اقَبل اَن تمُوتُو ا'' کے کیا معنی ہیں یا اس دنیا میں رہنےسہنے کے ساتھ انسان اِس عنصرستان سے قطعِ تعلّق کر کے اپنی زندگی کا زیادہ حصّہ عالمِ ملکوت میں کیوں کرصرف کرتا ہے۔اب اس مرتبہ جب کہ وہ اِصفہان سے حلب کو جا رہا تھا،اُسے ایک بہت ہی نئی حیرت میں ڈالنے والی چیز نظر آئی۔وہ جس گاؤں یادشت ودہ میں گُزرتا،اکثر لوگ خودبخو د اسے پہچان لیتے کہ جنت کی سیر کر آیا ہے اور پاس آ کے مبارک باد دیتے۔وہ دل میں پریشان تھا کہ یہ کیابات ہے اورکون سی علامت ہے جس کی وجہ سے لوگوں کومیری حالت معلوم ہو جاتی ہے!بعض لوگوں سے اِس راز کو دریافت بھی کیا مگرکسی نے کُچھ نہ بتایا،زمّرد اب اس کے دل و دماغ پر پہلے سےزیادہ حاوی تھی۔اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر حالت میں اس کی دلفریب تصویر پیشِ نظر رہتی۔کبھی اپنی طرف بُلاتی تھی اور کبھی صبر وتحمّل کی تاکید کرتی تھی۔یہی پریشان کن خواب دیکھتاہُوا شہر حلب میں پہنچا اور شیخ علی وجودی کے سامنے جاتے ہی ان کےقدموں پر گرا۔شیخ نے اُٹھا کے پیشانی چُومی اور پیٹھ ٹھونک کے اپنے برابر بٹھایااور کہا ''اے حسین!تو لاہوت اکبر کی سیر کر آیا۔''

حسین: یا شیخ! اُس عالمِ نور کی میں نے پوری کیفیت دیکھ لی ہے اوراے وادیِ ایمن! تیرے

پہلو میں مجھے وہ جلوہ نظر آ گیا جس کے اشتیاق کے سوال پر موسیٰ کو بھی ''لن ترانی'' کا جواب ملا تھا۔ مگر کیا کہوں کہ میں نے کن حسرتوں سے اس خطۂ نور کو چھوڑا ہے۔

شیخ: اے تیرہ و تار مُشتِ غبار! بتا تو نے وہاں کیا دیکھا؟

حُسین: ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی۔

شیخ: جذباتِ نور ایسے ہی ہوتے ہیں۔ زمّرد سے ملا تھا؟

حُسین: (شیخ کے قدم چوم کے) مِلا تھا۔ آہ! جی بھر کے دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ نظر کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

شیخ: مگر تیرا جسمِ خاکی اُس نورستان میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اگرچہ تو کہتا ہے مجھے یقین ہے کہ اُس عالمِ نور کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ مگر اے حسین، میں کہتا ہوں کہ تو نے نہیں دیکھا۔

حُسین: نہیں، اے شیخ اور اے وادیِ ایمن! میں نے دیکھا اور اپنی آنکھوں سے اِس وقت دیکھ رہا ہوں۔

حسین کا یہ جواب سُنتے ہی شیخ کو جلال گیا۔ منہ میں کف بھر آیا۔ آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ وہ جوش میں آ کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حسین مارے خوف کے سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ انھوں نے کہنا شروع کیا ''اے متکبّر و مغرور مُشتِ خاک! تیری کیا مجال کہ اس نورِ لم یزل کو ان ذلیل آنکھوں سے دیکھ سکے۔ تیرے جسم کے سامنے وہ تو غیر متغیر بن کے نمایاں ہوا تھا۔ اس کی اصلی کیفیات کو تیری یہ آنکھیں کسی طرح معلوم نہیں کر سکتی تھیں۔ مگر ہاں، تُو اُس کو دیکھے گا اور اُس کی اصلی حالت و کیفیت میں دیکھے گا۔ مگر کب؟ اس جسمِ خاکی کو چھوڑ کے اور مُجرّدِ محض بن کے۔ اُس وقت تجھے یہ بھی نظر آ جائے گا کہ اُسی نورِ ازل کا چراغ تو بھی ہے۔''

حسین: (کانپتی آواز سے) مگر میں تو ابھی وہاں سے آنا نہیں چاہتا تھا۔

شیخ: بے شک نہ آنا چاہتا ہوگا۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ نور کثافتِ مادّہ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

حسین: لیکن اے شیخ! آپ وادیِ ایمن ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں پھر اُس عالمِ نور میں جا سکتا ہوں۔ آہ! زمّرد کے لیے بہت پریشان ہوں۔

شیخ: (پھر طیش میں آ کے) اگر ہوس است ہمیں قدر بس است۔ اُس سروِ شبستان کو بے دیکھے قبول کرنے کی زحمت نہیں دی جاسکتی۔ آگ میں کسی مادّی چیز کو ڈال دو تو وہ اپنا تصرف کرنے کے بعد باقی ماندہ کثافت کو الگ پھینک دیتی ہے۔ اِسی طرح نورستان نے تیرے جسم کو اپنے حیّز سے نکال کے پھینک دیا ہے۔

حسین: تو پھر آپ ہی اپنے ہاتھ سے مجھے اِس جسم خاکی کی قید سے آزاد کیجیے تا کہ تجرد اختیار کر کے جاؤں اور پیاری زمّرد کو اپنے آغوش میں لے لوں۔ کیا عجب کہ اس وقت تک وہ میرے شوق میں اپنا آغوش پھیلائے ہوئے ہو۔

شیخ: اب وہاں تک تیری رسائی امامِ قائمِ قیامت کی دستگیری سے ہوسکتی ہے۔

حسین: گو میں اس برزخِ کبریٰ کے ہاتھ پر بیعت کر چکا ہوں مگر اس درگاہ میں میری رسائی اسی وقت ہوگی جب آپ میری مدد کریں۔ آپ کی دستگیری سب پر مقدّم ہے۔

شیخ: اچھا، مایوس نہ ہو، مجھے تیرا ایک دفعہ اور امتحان لینا ہے۔ اگر تو اِس امتحان میں پورا اُترا تو میں تجھے اس دربارِ امامت میں سفارش کے ساتھ پہنچادوں گا۔

حسین: جلدی فرمایئے۔ جو حکم ہو، اُس کو بجالانے کو تیار ہوں۔ موت کا سب سے زیادہ آرزو مند ہوں۔ اگر اس امتحان میں مجھے موت نصیب ہوگئی تو اس سے زیادہ میری کیا خوش قسمتی ہے۔

شیخ: اسی وقت شہرِ دمشق کی راہ لے اور جس طرح بنے امام نصر بن احمد کو جو ہم باطنیین کے خلاف وعظ کہا کرتے ہیں، قتل کر کے واپس آ۔

حسین: ابھی چلا۔ مگر مجھے اتنا اور بتا دیجیے کہ کیا ہم ہی وہ باطنیین ہیں جن کو کبھی لوگ قرامطہ کے اور کبھی ملاحِدہ کے نام سے یاد کرتے ہیں؟

شیخ: بے شک۔ ہم اسماعیل بن جعفر صادقؒ کی امامت کے مدّعی ہیں۔ اور چونکہ امامت ظاہر ہو گئی، لہٰذا ہم پر فرض ہے کہ اس کی تبلیغ و نقابت خفیہ اور باطنی طریقوں سے کریں۔ انوارِ ازل نے یہ قدیم ہی سے فیصلہ کر دیا ہے کہ جب تک امامت ظاہر رہتی ہے، نقابت و تبلیغ خفیہ ہوتی ہے، اور جب امامت مخفی و باطنی ہو جاتی ہے تو نقابت و تبلیغ علانیہ ہونے لگتی ہے۔

حسین: مگر اس کا سبب میرے ناقص فہم سے بالاتر ہے۔

شیخ: بے شک بالاتر ہے (زور سے گھور کے) اور تیرے جاہلانہ شکوک اِسے اور زیادہ بالا کرتے جاتے ہیں۔ خود خدا کی طرف خیال لے جا کہ وہ مخفی ہے اور اسی لیے اُس کی توجہ کی تبلیغ علانیہ ہوتی ہے۔

حسین: یا وادیِ ایمن! نبوت تو ظاہر رہی اور اس کے ظہور کے زمانے میں برابر علانیہ تبلیغ ہوتی تھی۔

شیخ علی وجودی کے منہ میں کف بھر آیا۔ سخت برہمی کے لہجے میں وہ چلّائے "ابھی تک شیطان تیرے دل میں بیٹھا ہے، وہ تجھے بہکا رہا ہے اور عالمِ نُور میں جانے کی آرزو رکھتا ہے۔ سُن! اس نظام کا تعلق صرف امامت سے ہے۔ نبوت ہمیشہ ظاہر رہی اور ظہور کے زمانے میں علانیہ تبلیغ ہوتی رہی۔ نبوت اور رسالت کس چیز کی طرف لوگوں کو بُلاتی ہے؟ خدا کی طرف اور فردوسِ بریں کی

طرف۔اور یہ دونوں دنیا کی نظر میں مخفی ہیں۔

حسین: (ڈرتے ڈرتے) مگر امامت بھی تو انھی چیزوں کی طرف بُلاتی ہے۔

اب شیخ کو غصّے نے آپے سے باہر کر دیا۔ایک دفعہ چمک کے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا "تو عالمِ نُور کی سیر کرنے پر بھی جاہل اور شکی ہے۔عہدِ نبوت میں جنت اور نور الانوار اس قدر نمایاں نہ تھے جتنے کہ اب عہدِ امامت میں ہیں۔رسالت نے کبھی کسی مادّی پیکر کو اُس سروِ شبستان میں نہیں بھیجا اور امامت برابر بھیج رہی ہے، جس کا یہ قطعی نتیجہ ہے کہ فردوسِ بریں اور نورِ ازلی پہلے مخفی تھے اور اب نمایاں ہیں۔اور چونکہ اب نمایاں ہیں لہذا تبلیغ اور نقابت کو خفیہ طریقوں سے ہی اپنا عمل کرنا چاہیے۔

حسین: یا وادیِ ایمن! اب مجھے اطمینان ہو گیا۔اور ضرور تھا کہ اپنے شکوک رفع کرتا۔اس لیے کہ میں نے اِس مذہب کی نسبت بہت سی بے سروپا باتیں سنی تھیں۔سُنا تھا کہ اَلموت کے قلعے میں لوگ طرح طرح کے فریبوں سے اس مذہب کے پابند بنا لیے جاتے ہیں۔

شیخ: یہ دشمنوں اور جُہلا کی اِفترا پردازیاں ہیں۔ایسے لوگ جن کو چشمِ بصیرت نہیں اور انوارِ ازلیہ کے سامنے خفّاش سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، اُن کے کہنے کا کیا اعتبار۔اتنے مدارجِ یقین طے کر کے تجھے نظر آ گیا ہو گا کہ ہم کس ملاءِ اعلیٰ پر ہیں اور کس آسانی سے سروِ شبستان کی سیر کراتے ہیں۔اور وہ کس قعرِ جہالت میں پڑے ہیں اور کس تحت الثریٰ کی طرف روز بروز زیادہ دھنستے چلے جاتے ہیں۔

حسین: مجھے معلوم ہے۔

یہ کہہ کر حسین شیخ سے رخصت ہوا اور امام نصر بن احمد کی جان لینے کے لیے دمشق کی راہ لی۔

حسین اب ایسے کاموں کے لیے جری تھا۔ پہلے موقع پر جو شبہات اُس کے دل میں پیدا ہوئے تھے ،اب نام کو بھی نہ تھے۔ اس کو یقین تھا کہ جنت یقیناً ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کا وہ معتقد ہے ۔اور اُن کے اشارے پر بُرے بھلے کام کا کرنا ہی ذریعہ نجات ہے۔ باوجود اِس کے ایک جلیلُ القدر عالم کے قتل میں اُس کے دل نے کسی قدر پس وپیش ضرور کیا۔ مگر شیخ اور زمّرد کے خیال نے پھر اس کا دل آگے بڑھایا۔ وہ نہایت سنگ دلی کے ساتھ مُرشد کے وحشیانہ حکم کی تعمیل کے لیے دمشق میں پہنچا اور امام نصر کے عقیدت کیشوں میں شامل ہوگیا۔

اس سفر میں بھی وہ حیرت سے دیکھتا تھا کہ بعض لوگ راہ چلتے چلتے پہچان کر اُس سے بغلگیر ہوتے اور یک جہتی واخوت کا ثبوت دیتے، جس سے اسے یہ بھی نظر آ جاتا تھا کہ اس کے ہم عقیدہ وہم خیال کس کثرت سے دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خوش نصیبی یا دل کی بے صبری سے مہینے ہی بھر میں اسے اپنی غرض حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ ایک رات پچھلے پہر جب کہ امام نصر پڑوس کی مسجد میں اور سب سے چھپانے کے لیے اندھیرے میں تنِ تنہا کھڑے نمازِ تہجد ادا کر رہے تھے، حسین کا خنجر اُن کے دل میں اُتر گیا۔ جب لاش بالکل ٹھنڈی ہوگئی تو پچھلی رات کے سناٹے ہی میں مسجد سے نکل کے چلا گیا اور راستے میں ایک نہر کے کنارے بیٹھ کے اپنے کپڑے دھو کر حلب کو روانہ ہُوا۔

شیخ علی وجودی نے اس کی کارکردگی کی داد دی اور اس کی پیٹھ ٹھونک کے کہا کہ حسین تو مراحل یقین کو بہت جلد طے کر رہا ہے اور اپنے اغراض میں کامیاب ہوگا۔

حُسین: یا وادیِ ایمن: مجھے ایک امر پر بڑی حیرت ہے، میں جہاں جاتا ہوں اور جس جگہ جاتا ہوں،

میرے ہم خیال و ہم عقیدہ صورت دیکھتے ہی مجھے پہچان لیتے ہیں اور میں اُن کو نہیں پہچان سکتا۔
یہ سُنتے ہی شیخ نے ایک صندوق سے ایک آئینہ نکالا اور اسے دکھا کر کہا کہ اپنی صُورت دیکھ، تجھے اپنے چہرے پر کوئی چیز نظر آتی ہے؟

حُسین: ہاں، پیشانی پر داغ ہے۔مگر معلوم نہیں کیسا داغ ہے۔شاید بچپن میں کبھی کہیں گر پڑا ہوں گا۔

شیخ: (مسکرا کے) نہیں۔ یہ حور کے بوسے کا نشان ہے۔یہی ایک مُہر ہے جو ہمیشہ اِس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ انسان اپنے قفسِ عنصری کے ساتھ فردوسِ بریں کی سیر کر آیا ہے۔

حُسین: تو جن لوگوں نے مجھے پہچانا، غالباً اُن کی پیشانیوں پر بھی حُور کے بوسے کا نشان موجود ہو گا۔

شیخ: بے شک ہو گا۔اور حسین! دیکھ میری پیشانی پر موجود ہے۔

حُسین: (شیخ کی پیشانی پر بھی وہی اپنا سا داغ دیکھ کر) بے شک۔ یہ مدارجِ یقین طے کرنے کا تمغا ہے۔

شیخ: حسین! یہ بہت بڑی چیز ہے۔مرنے کے بعد سب مومنین جنت میں جائیں گے۔مگر جو لوگ دنیاوی زندگی ہی میں اُس مرکزِ نور کی سیر کر چکے ہیں، اُن کا یہ فخر وہاں بھی موجود رہے گا۔یہ داغ وہاں پیشانیوں پر نور کی طرح چمکے گا اور عام ناجیوں میں ہم لوگوں کو ممتاز ثابت کرے گا۔

حُسین: مگر مجھے یہ داغ دُنیا ہی میں عزیز ہے۔کاش! میرے لب میری پیشانی تک پہنچ سکتے کہ میں اس داغ کو بوسے دے کے اپنے دل کی تسلی کرتا۔میری پیشانی پر سوائے زمّرد کے اور کسی کے بوسے کا نشان نہیں ہو سکتا۔اگر میرے بوسے لیے ہیں تو صرف اُسی کے لبِ لعلیں

نے۔ مگر افسوس! جس طرح زمّرد میرے دل میں ہے، ہاتھ میں نہیں آ سکتی، اسی طرح اس کے بوسے کا نشان ہر وقت میرے پاس ہے اور مجال نہیں کہ اپنے مشتاق ہونٹوں کو وہاں تک پہنچا سکوں۔

شیخ: اب اِن شاعرانہ خیالات کو دور کرو اور امامِ قائم قیامت کی قدم بوسی کیلئے تیار ہو جاؤ۔

حسین: لبیک! مگر اے وادیِ ایمن! اتنا اور بتا دیجیے کہ اُن کو امامِ قائم قیامت کیوں کہتے ہیں ؟

شیخ: یہ بھی رموزِ ربانی میں سے ایک رمز ہے۔ تجھے شاید ابھی تک ان ائمہ کے نام بھی نہیں معلوم نہ ہوں گے جو نورِ لم یزل کی شعاعیں ہیں اور مختلف جسدوں سے نمایاں ہوتے رہتے ہیں ۔ یہی ائمہّ ہمیشہ ناسُوتِ اکبر ہوتے رہتے ہیں ۔ وہی وجود آدمؑ، نوحؑ۔ ابراہیمؑ، موسیٰؑ، داوٗدؑ، سلیمانؑ، عیسیٰؑ اور محمد صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کے اجساد مطّہرہ سے جلوہ فگن ہوتا رہتا تھا۔ آخر علی مرتضیٰؓ کے جسدانوں میں نمودار ہوا۔ اور چونکہ اب نبوت ختم ہو چکی تھی، لہٰذا ایک روح نے مختلف اجساد بدلنے شروع کیے۔ پھر حسین اور علی زین العابدین و محمد باقر علیہم السّلام کے اجساد کی سیر کرتے کرتے وہ نور جنابِ جعفر صادق کے جسدانوں سے نمایاں ہوا اور وہ زندہ ہی تھے کہ ان کے پیکر جسدی کو چھوڑ کے پہلے جنابِ اسماعیل میں پھر محمد مکتوم ابن اسماعیل میں جو سابع امام تھے آیا۔ چندروز تک وہ نور سلسلہ وار امام منصور بن محمد مکتوم جعفر صادق اور حبیب بن جعفر کے اجسام مطّہرہ میں خفیہ ہی خفیہ لمعہ فگن رہا۔ جنابِ اسماعیل سے اِس وقت تک امامت مخفی ہی رہی۔

اب یکایک اس نور نے عُبید اللہ مہدی کی ذات سے نمایاں ہو کے اپنی پوری تنویر دکھا دی اور امامت ظاہر ہوگئی۔ اس کے بعد سے وہ نور برابر علانیہ طور پر مختلف اجسادِ ظاہرہ کو بدلتا رہا۔ پہلے قائم

بامر اللہ کے جسم سے، پھر منصور کے پھر معزّ الدین اللہ کے جسم سے چمکا۔ مستقر باللہ کے بعد پھر حسن بن محمد یعنی علی علیہ السّلام پھر محمد بن علی علیہ السّلام کے جسموں کے لاہیئت کبریٰ کا درجہ پایا اور فی الحال وہی انوارِ ازلی رکن الدین خورشاہ کے جمالِ جہاں آرا سے نمودار ہیں جو فرمانروائے الموت ہیں۔ وہ امام قائم قیامت، برزخِ اکبر ہیں اور لاہُوت و ناسُوت و تجلّی ہیں جو مختلف جسد ہائے امامت و نبوت سے لمعہ افگن رہی ہیں۔

حُسین: (حیرت سے) وہی جن کے ہاتھ پر میں نے اس عالمِ لاہُوت میں بیعت کی تھی؟

شیخ: وہی۔

حُسین: مگر آپ تو فرماتے ہیں کہ وہ الموت کے فرماں روا ہیں؟

شیخ: بے شک۔ مگر یہ علائقِ دنیوی اُن کے تجرد اور ان کی اس نورانیت کو جو عالمِ سروش میں لے جاتی ہے، دُھندلا نہیں کر سکتے۔ امامِ دینی اور عام لوگوں میں یہی فرق ہے کہ جس چیز کو ہم ریاضت سے حاصل نہیں کر سکتے وہ انھیں بدرجۂ اَتم حاصل رہتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ عالمینِ برزخ کہے جاتے ہیں۔

حُسین: اور وہ امامِ قائم قیامت کیوں کہلاتے ہیں؟

شیخ: (کسی قدر برہم ہوتے ہوئے رُک کر) ہاں۔ میں نے اس کا راز ابھی نہیں بتایا۔ امامین مستنصر ونزار کے عہد میں ان میں انوارِ ازلی کی ایک نئی اور غیر معمولی شمع روشن ہوئی تھی۔ گو یہ شمع دراصل قدیم نورِ امامت کا انعکاس تھی مگر اتنا بڑا انعکاس کامل کہ اس کے جلوے سے تمام ممالکِ ارض چمک اُٹھے۔ اِس سے وہ چراغِ نور مراد ہے جو صباح کے جسمِ صافی میں چمکا تھا۔ یہ لقب قائمِ قیامت اسی آئینہ پرتو نورِ ایزدی کا ہے جس نے یکا یک حدود و مدارجِ اعلیٰ اور نورستان میں

پہنچ جانے کے اتنے صحیح ذریعے مخلوق میں پیدا کر دیے کہ ادنیٰ لوگوں کو وہ کمال حاصل ہو گیا جو گزشتہ عہدوں میں انبیاء اور ائمہّ کے سوا کسی کو حاصل نہ تھا۔ پہلے کوئی فردوسِ بریں میں جانے کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا مگر اب اس اعلیٰ پرتوِ ایزدی کو ظہور کے بعد یہ حالت ہے کہ میں آنکھیں بند کر کے ایک دم میں اُس عالمِ نور کی سیر کر آتا ہوں۔ اور تم بھی اس سروِ شبستان میں جا کے حُوروں کی ہم کناری کا مزہ اُٹھا آئے ہو۔ قیامت کے معنی ظاہر پرستوں میں اس وقت کے ہیں جب کہ دنیا کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ مگر حقیقت شناس جانتے ہیں کہ قیامت صرف اُس حالت یا اُس وقت کا نام ہے جب کہ مخلوق کو خالق سے یا پرتو کو نور سے قُربت ہو جائے۔ حسن بن صباح نے چوں کہ اپنے عہد سے مخلوق کو ایسے تقرب کے درجے پر پہنچا دیا لہٰذا وہ امامِ قائمِ قیامت کہلاتے ہیں یعنی وہ امامت جس کی بدولت مخلوق اور خالق میں قُربت ہو گئی اور اسی قُربت کا نتیجہ ہے کہ اُن کے چند ہی روز بعد امام علی ذاکرۃ السّلام میں امامتِ قدیمہ جو جنابِ علی مرتضیٰ سے نسلاً بعد نسلٍ چلی آتی تھی۔ نیز وہ امامت قائمِ قیامت جس کا چراغ پہلے پہل حسن بن صباح کے اخیر میں روشن ہوا دونوں امامتیں جمع ہو گئیں۔ اور یکا یک انوارِ لم یزلی ہیجان میں آ گئے۔ بس اسی دن سے تمام تکلیفاتِ شرعیّہ بندوں پر سے اُٹھا دی گئیں۔ رمضان کی ۲۷ کو اس قُربتِ پُرنور کا جلوہ نظر آیا تھا اور مومنینِ شرعی ان قیدوں سے آزاد ہوئے تھے۔ اسی سبب سے وہ دن ہمارے لیے عید ہے۔

حسین: (متحیّر ہو کے) مگر میں تو دیکھتا ہوں کہ آپ شب و روز ریاضت ہی میں مشغول رہتے ہیں اور آپ ہی کی طرح اس فرقۂ ناجیہ کے جتنے پیرو مجھے ملے، سب پابند شرع، بڑے محتاط اور بڑے متقی و پرہیز گار نظر آئے۔

شیخ: جولوگ عرفان وحقیقت کے مدارج طے کرنا چاہتے ہیں، ان کو مشکلاتِ ریاضت طے کرنی پڑتی ہیں۔مگر مومنین پر فرض اب کوئی عبادت نہیں۔خاصتہً اُن برگزیدگانِ لَم یزلی کے لیے جوامامِ قیامت سے تقرب رکھتے ہوں۔

حُسین: مگراے وادیِ ایمن! میرا دل آپ کی توجہ کامحتاج ہے۔تکلیفات شرعیہ کا اُٹھا دینا ایک ایسی چیز ہے جس سے میرے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں۔

شیخ: (برہمی کے ساتھ) اتنے مدارج طے کرنے پر بھی شک؟سروشبستانِ عالمِ نور کی سیر کر چکنے کے بعد شک؟اب یہ شک نہیں، گستاخی ہے۔جانتا ہے کہ ساری عبادتیں خداوندِ جلّ وعلّیٰ کی قُربت حاصل کرنے کے لیے ہیں۔اور جب وہ قربت حاصل ہو جائے تو پھر کسی عبادت کی ضرورت نہیں رہتی۔تم نے سنا ہے اور دیکھ بھی لیا ہوگا کہ جنت میں کوئی شخص عبادت کامکلّف نہیں۔اس کا یہی منشا ہے کہ ہم قُربِ انوارِلم یزل کے لیے عبادت کرتے ہیں اور وہاں ہر ایک کو یونہی حاصل ہوتا ہے۔

حُسین: بے شک۔وہ منزلِ مقصود ہے اور عبادت اس کا راستہ۔جنت میں پہنچ جانے کے بعد فی الحقیقت کسی عبادت کی ضرورت نہیں۔لیکن جولوگ ابھی اس کے باہر ہیں ان کی نسبت نہیں کہا جاسکتا کہ منزلِ مقصود کو پہنچ گئے یا چل رہے ہیں یاں راستے میں ہیں لہٰذا ان کو عبادت کی بھی ضرورت ہے۔

شیخ: (انتہا سے زیادہ ازخود رفتہ ہو کے اور منہ میں کف بھر لا کے) اس پیکرِ خاکی کو شُبہات ہی نے خراب کیا ہے۔یہ برابر شک کرتا ہے اور اپنے شکوک میں بڑا ضدّی ہے۔سُن اے حسین! امامِ قائمِ قیامت نے جو اپنے آپ کو بتایا کہ وہ اس عالمِ نور میں ہیں اور جزوِعنصری سے باہر اس

کے یہی معنی تھے۔ گو بظاہر اُن کا جسد اس عالمِ مادّی میں نظر آتا ہے مگر دراصل وہ اِن مادّیات سے دور سرو شبستانِ اعلیٰ میں ہیں اور اُن سے ملنے اور ان کے جوار میں رہنے کے یہی معنی ہیں کہ گویا انسان اِس تیرہ ظُلمت کدۂ ارض سے نکل کر لاہُوتِ اکبر کے قریب جا پہنچا۔ پھر وہاں پہنچ جانے کے بعد عبادت کیسی؟

حُسین: بجا ہے۔ میرا شبہ دور ہو گیا۔ آپ کی تقریر سے ہمیشہ ایسے شکوک دُور ہو جاتے ہیں، اور یہی اطمینان حاصل کرنے کے لیے میں اپنے شبہوں کو بلا تأمّل آپ کی خدمت میں عرض کر دیتا ہوں۔

شیخ: خیر، تم اس امتحان میں بھی پورے اُترے ہو۔ اب تم کو امام علیہ السّلام کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ جاؤ اور ان کے احکام کی بلا عُذر اطاعت کرو۔ آج صفر کی ۲۰ ہے۔ رمضان کی ۲۷ کو عید قائم قیامت ہو گی۔ اس تاریخ کو میں بھی وہاں آؤں گا اور شیخ طورِ معنی بھی وہاں موجود ہوں گے۔ اگر اتنے دنوں میں تم نے امام قائمِ قیامت پر اپنی عقیدت کیشی و اطاعت کا پُورا اثر ڈال دیا تو میں تمھاری سفارش کروں گا اور طورِ معنی بھی کریں گے۔ اور اسی وقت تم کو زمرّد سے ملنے میں کامیابی بھی حاصل ہو گی۔ مگر خیال رکھو کہ اُس اعلیٰ دربار میں انسان کے سر سے بہت سے تکلیفاتِ شرعیّہ اُٹھ جاتے ہیں۔ وہاں کی اطاعت و عبادت صرف اِنقیاد ہے۔ اگر اس میں کوتاہی ہوئی تو پھر اس کا علاج نہ میرے پاس ہے نہ کسی اور شخص کے پاس۔ اس درگاہ کا راندہ مرُدودِ ازلی اور رحمتِ الٰہی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہے۔

حُسین: میں کسی حکم سے سر نہ پھیروں گا۔

شیخ: وہ ایسا مقام ہی نہیں جہاں تم اپنے دل کے شکوک کو اسی بے تکلفی سے ظاہر کرو جس طرح

میرے سامنے کرتے ہو۔

حُسین: کبھی کسی امر میں شک نہ کروں گا۔

شیخ: اگر اتنے مضبوط ہو تو کل صبح تم یہاں سے روانہ ہو کر الموُت کی راہ لو۔ میں ایک خط لکھ دوں گا۔ اسے لے کر امام کی خدمت میں حاضر ہونا اور جب تک وہاں سے یا مجھ سے کوئی حکم نہ ملے، اُس دربار کو نہ چھوڑنا۔

حُسین: ہرگز نہیں (یہ کہہ کے اس نے شیخ کے قدم چوم لیے)۔

دوسرے دن علی الصّباح وہ شیخ علی وجودی سے خطِ سفارشی لے کے رُخصت ہوا اور مشرق کی راہ لی۔ چند روز میں بغداد و اصفہان ہوتا ہوا علاقہ رُودبار میں پہنچا۔ اِس سفر میں وہ اپنے ہم مذہبوں کو دُوروں کے بوسوں کے نشان سے بے کچھ کہے سُنے پہچان لیا کرتا تھا، جو ہر شہر و قریہ میں ملتے تھے اور اس کے ساتھ نہایت ہی خلوص و عقیدت سے پیش آتے تھے۔ ویلم کے ایک گاؤں میں ایک باطنی شخص جو اپنی پیشانی کے نشان سے بتا رہا تھا کہ وہ بھی جنت الفردوس کی ہوا کھا آیا ہے، حسین کو نہایت ہی خلوص و پاک دلی سے اپنے گھر لے گیا اور کئی دن تک مہمان رکھا۔

اُس شخص کے گھر پر ایک صحبت میں کئی ایسے باطنی جمع ہوئے جن کو اسی دو سال کے اندر جنت کی ہوا کِھلائی گئی تھی۔ لوگوں نے صحبت کو اغیار سے خالی اور اپنے ہم عقیدہ و ہم خیال لوگوں ہی پر محدود دیکھ کے باہر جنت کا تذکرہ شروع کیا۔ اثنائے کلام میں ایک شخص بولا ''مگر مجھے جنت میں بھی ایک تمنا رہ گئی۔''

دُوسرا: (حیرت سے) وہ کیا؟

پہلا: وہاں ایک ایسی دل فریب نازنین نظر آئی کہ دل بے اختیار ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن خدا

جانے کیا بات تھی کہ ہزار کوشش کی مگر اس آفتِ زمانہ حُور نے بات کا جواب تک نہ دیا۔

دُوسرا: واقعی تعجب کا مقام ہے۔ جنت میں تو ایسا نہ ہونا چاہیے۔ کسی حُور کی طرف تمھارے دل کا میلان ہو اور وہ اِلتفات نہ کرے تو یقیناً سارا لُطف خاک میں مل جائے گا۔

یہ سن کر ایک تیسرا شخص بول اُٹھا ''حقیقت میں اس قسم کے بعض نقصانات وہاں انسان کو نظر آ جاتے ہیں۔ اس مسئلے کو میں نے شیخ کے سامنے بھی پیش کیا تھا جنھوں نے بہت آسانی سے میرا اطمینان کر دیا۔ اُنھوں نے بڑے جوش وخروش سے کہا تھا اور گویا اس وقت بھی میرے کان میں کہہ رہے ہیں کہ تم اپنے مادّی پیکر کے ساتھ ہزارہا کثافتیں اور دنایتیں لے کے تو اس عالمِ نور میں جاتے ہو اور پھر اُمید کرتے ہو کہ سروِ شبستان کو اسی پاک و مجرّد حیثیت سے دیکھو جس طرح غیر مادّی آنکھیں دیکھتی ہیں، خود تمھارے نقصان اور تمھارے مادی عجز ہیں جو اس حیز نور کو معیوب دکھاتے ہیں۔

پہلا: اور وہاں میں نے یہ بھی سُنا تھا کہ اُس حُور میں ذاتاً نقصان موجود تھا، پھر تم کو اپنی مادّی آنکھوں سے اور زیادہ بدنما نظر آیا تھا۔

دُوسرا: بے شک۔ یہی سبب ہوگا۔ اول تو اُس حُور میں ذاتاً نقصان موجود تھا، پھر ہمیں اپنی مادّی آنکھوں سے اور زیادہ بدنما نظر آیا۔

حسین: (کسی قدر تعلقِ خاطر سے) اور کچھ یہ بھی معلوم ہوا کہ اُس حُور کا نام کیا تھا؟

پہلا: ہاں۔ مجھے بتایا گیا کہ اس کا نام زمّرد ہے۔ اور میری حُور نے جس کے آغوش کا مزہ زندگی بھر نہ بھولے گا، یہ بھی بتایا کہ اُسے کسی خاکی پیکر سے اِس قدر تعلق ہے کہ جنت کی سیر کرنے والوں میں کسی کی طرف اِلتفات نہیں کرتی۔

دوسرے دن حسین یہاں سے رخصت ہو کر آگے روانہ ہوا اور دو ہی چار روز میں قلعۂ المُوت کے

پھاٹک پر کھڑا تھا۔

چھٹا باب

مردُودِ اَزلی

قلعہ الموت کے پھاٹک پرحسین روکا گیا، اور چونکہ اندر داخل ہونے کا اجازت نامہ نہیں پیش کرسکا لہذا وہی خط جو شیخ علی وجودی نے لکھ دیا تھا۔ اس سے لے کے قعلہ دار کے پاس بھیجا گیا۔ پھر رُکن الدین خورشاہ کے ملاحظہ میں پیش کیا، جواُن دنوں تمام باطنین کا امام اور علی ذاکرہُ السّلام کا پوتا تھا ۔خورشاہ کا ہنوز اُٹھتا شباب تھا۔ مگر چونکہ اُن لوگوں کی عقیدت میں امام پیدا ہوتے ہی امام ہوتا ہے لہذا اُن کے تقدس ووجاہت میں نوعمری سے کوئی فرق نہیں ہونے پاتا۔ ان کے نزدیک اگر رتبۂ امامت حاصل ہوتو ایک چھ برس کا بچہ اور ساٹھ برس کا بوڑھا دونوں یکساں معصوم ہیں اور دونوں کے احکام یکساں طریقے سے واجبُ التعمیل ہیں۔ یہ سلطنت اور یہ مذہب دونوں حسن بن صباح کی بےنظیر کوششوں سے قائم ہوئے تھے جس کو اب ڈیڑھ سو برس گزر چکے تھے۔ اور باوجودیکہ دنیا میں بڑے بڑے انقلاب ہوگئے مگر اس خاندان کا وہی دوردورہ رہا۔ بعض دلیر اور اُولوالعزم حملہ آوروں نے دو ایک مرتبہ یہاں سیاسی قوت کو ضرر پہنچایا مگر بعض اثرات پہلے سے زیادہ ترقی پر ہیں اور اَلمُوت کا قلعہ اسی طرح مامون ومحفوظ چلا آتا ہے جس پر مخالفت کے ساتھ کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔

مذہبی مقتدائی کا تاج تو یہاں کے تاجداروں کے سر پر ابتدا ہی سے تھا مگر علی ذاکرہُ السّلام کے عہد سے یہ لوگ اپنے آپ کو امام اور یادگارِ خاندانِ بنی فاطمہ بھی کہنے لگے۔ اس لیے کہ ذاکرہُ السّلام نے دعویٰ کیا کہ جب میں بچہ تھا تو نزار بن مستنصر فاطمی کے پوتے سے مخفی طور پر بدل لیا گیا۔ اس وقت اِن لوگوں نے علانیہ امامت کا دعویٰ کردیا اور اب اپنے آپ کو نورِ محض اور لاہُوت وناسُوت کا

برزخ ظاہر کرتے ہیں۔ جو لوگ بادشاہ یا امام کے احکام بے عُذر، بے حُجّت، آنکھیں بند کر کے، بجا لاتے ہیں اور جن کے خنجر سے سارا زمانہ کانپ رہا ہے، فدائی کہلاتے ہیں۔ ان کی یہ حالت ہے کہ مُقتدا اور فرماں روا کے حکم پر جان دینا اور خودکشی ہی کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ انھی فدائیوں کی وجہ سے جو رعب و ادب رُکن الدین خورشاہ کے دربار میں ہے، شاید اس عہد کے کسی بادشاہ کے دربار میں نہ نظر آتا ہوگا۔ یہاں کسی کی اتنی بھی مجال نہیں کہ بادشاہ کے سامنے بے ادبی و مخالفت کا خیال بھی دل میں لا سکے۔

شیخ علی وجودی کا خط دیکھتے ہی حسین کو باز یابی کی اجازت دی گئی۔ حسین نے سامنے جا کے جیسے ہی فرماں روائے اَلمُوت کی صورت دیکھی، دوڑ کے قدموں پر گر پڑا اور چلّایا:

''ہٰذا اِمامی! ہٰذا اِمامی'' رُکن الدّین اس کے اُٹھانے کے لیے جھکنے ہی کو تھا کہ اہلِ دربار میں سے بعض ممتاز لوگوں نے اسے اُٹھا کے کھڑا کیا اور کہا ''بے شک یہی امامِ زمانہ ہیں اور نورِ محض ہیں مگر ادب و صبر سے کام لو اور جو التجا ہو، پیش کرو۔''

خورشاہ: اے نوجوانِ آملی! تجھ میں کیا بات ہے کہ وادیِ ایمن تیری انتہا سے زیادہ تعریف کرتے ہیں۔ وہ تیرے علم و فضل کے بھی مداح ہیں اور تیری بہادری و جاں بازی کے بھی۔

حُسین: (ادب سے زمین چوم کر) صرف اسی سبب سے کہ میں نے اُن کی خدمت گزاری میں کوئی وقیقہ نہیں اُٹھا رکھا، اور کبھی اس بحرِ حقیقت کے حکم سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں کی۔

خورشاہ: اور اب شیخ نے تجھے کس غرض سے یہاں بھیجا ہے؟

حُسین: یا امامِ قائمِ قیامت! میں فردوس کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔

خورشاہ: (غور کر کے) ابھی تک تو اُن لمعاتِ انوارِلم یزل سے یہی آواز آ رہی ہے کہ لیکن

ترانی۔

حسین: یا امامِ قائمِ قیامت کی توجہ نے شفاعت کی تو ممکن نہیں کہ میری آرزو برنہ آئے۔

خورشاہ: اے بوالہوس پیکرِ خاکی! ابھی اس کے متعلق تجھے کسی قسم کی اُمید نہیں دلائی جاسکتی۔

یہ کہہ کے خورشاہ ایک اور شخص کی طرف متوجہ ہونے کو تھا کہ حسین نے آبدیدہ ہو کے اور پُر درد اور مایوسی کی آواز میں کہا ''تو اس ادنیٰ جاں نثارِ بارگاہِ امامت کو اجازت ملے کہ اس آستانے پر ٹھہر کے اُس وقت کا انتظار کرے جب کہ یہ آرزو بر آئے گی۔ آیندہ عیدِ قائمِ قیامت کے موقع پر وادیِ ایمن بھی یہاں تشریف لائیں گے اور کیا عجب کہ اُس دِن جب کہ قائمِ قیامت اور امام یک جا ہوں گے اور مخلوق کو خالق سے یا پرتو کو نور سے زیادہ قربت ہوگی، میری دُعا قبول ہو جائے۔

خورشاہ: اچھا، ٹھہرو۔ مگر یہ خیال رہے کہ یہاں کے امتحان زیادہ سخت ہیں۔

حسین: میں ہر قسم کے امتحان دینے کو تیار ہوں۔

خورشاہ نے اس کے بعد دوسرے شخص کی طرف توجہ کی اور پوچھا ''دیدار کب آئے؟''

دیدار: (ہاتھ جوڑ کے) آج ہی صبح کو۔

خورشاہ: اور جس کام کے لیے گئے تھے، وہ پورا ہو گیا؟

دیدار: میرا خنجر کبھی خالی گیا ہے؟ اگرچہ مہم دشوار تھی مگر جنت کے شوق میں وہاں پہنچا اور امام کے حکم کو نہایت کامیابی سے پورا کیا۔

خورشاہ: ہاں، بیان کرو۔ تم نے چغتائی خان کو کیوں قتل کیا؟

دیدار: یا امامِ قائمِ قیامت! ترکستان میں اِس جاں نثار کا نام متقی تھا۔ وہاں کی مختلف صحبتوں میں شریک ہو کے فدوی نے ایسی ہر دل عزیزی پیدا کی کہ منقو خان چغتائی خان کے بہادر بیٹے کے

دل میں مجھ سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ اُس نے مجھے بُلوا کے اپنے گھر میں رکھا اور کئی مہینے تک یہی حالت رہی کہ جب تک میں نہ ہوتا کسی بات میں اُس کا دل ہی نہ لگتا۔ اس نے مجھے اپنے باپ سے ملایا۔ چغتائی خان بھی میری باتوں کا دیوانہ تھا۔ چند روز تک باپ بیٹوں کا میرے سوا کوئی انیس وجلیس نہ تھا۔ چغتائی خان اپنی ذات سے ایسا زبردست اور قوی ہیکل واقع ہوا تھا کہ اس پر حملہ کر کے کامیاب ہونا مجھے نہایت دشوار نظر آیا اور اس وجہ سے مجھے کئی مرتبہ موقع ملنے پر بھی جرأت نہ ہوئی۔ آخر ایک روز رات کو جب ہلاکو خان کسی بڑی مہم سے آیا تھا اور منقو خان اس سے ملنے گیا تھا، چغتائی خان مجھے تنہائی میں سوتا ہوا مل گیا۔ اس سے زیادہ مناسب موقع ملنے کی اُمید نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے چپکے ہی چپکے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں ایک رسّی سے باندھ دیے اور پھر اس پر چڑھ کے اس کا کام تمام کیا۔ اس کے بعد میں واپس چلا آیا۔ مگر مجھے حکم ہوا تھا کہ ان لوگوں کو بتا بھی دوں کہ چغتائی خان قتل کر دیا گیا۔ اِس غرض کے لیے اِن تمام حالات کو ایک خط میں لکھ کے میں نے پہلے ہی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اب اُسی خط کو لے کے ہلاکو خان کی فرودگاہ کی طرف چلا۔ خوش نصیبی سے چغتائی خان کی بیٹی راستے میں مل گئی جو ہلاکو خان سے مل کے اپنے گھر کو آ رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں مَیں نے وہ خط اُس کے ہاتھ میں چپکے سے رکھ دیا اور بھاگ کے قریب کے جنگل میں چھپ رہا۔ دوسرے دن صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ قراقرم ماتم کدہ بنا ہوا ہے اور ہر شخص کو میری جستجو ہے۔ بعدہ، موقع پا کے میں نے ایک غار میں پناہ لی اور پورے آٹھ دن تک اسی میں چُھپا بیٹھا رہا۔ نویں دن جب میدان خالی نظر آیا تو اس غار سے نکل کے اِدھر کو روانہ ہوا۔ تین مہینے بعد اب آستان بوسی کو عزّت حاصل کر رہا ہوں۔

خورشاہ: بے شک، دیدار۔ تم نے بڑا کام کیا اور مستحق ہو کہ تمھیں آج ہی جنت کی سیر کرائی

جائے۔

یہ سُنتے ہی دیدار خورشاہ کے قدموں میں گر پڑا۔خورشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے اُسے اُٹھایا اور ساتھ ہی لے جانے کو تھا کہ حسین نے از خود رفتگی کے جوش کے ساتھ کہا ''اے بے رحم بادشاہ! میں سب سے زیادہ جنت میں جانے کا آرزومند ہوں اگر یوں نہیں تو میرا امتحان لیا جائے۔ بتایا جائے کہ میں بھی کسی کو قتل کروں۔آہ!زمّرد کے فراق میں صبر نہیں ہوسکتا۔

خورشاہ: ابھی نہ تمھارا امتحان لیا جاسکتا ہے اور نہ تم کو باغِ فردوس میں جانے کا کوئی استحقاق ہے۔

حسین: (جوش وخروش سے) مجھ سے زیادہ مستحق کوئی نہیں۔ میں نے امام نجم الدین نیشا پوری کے زندگی کا چراغ گل کیا ہے۔امام نصر بن احمد کو خون میں ہاتھ رنگ چکا ہوں۔اب اس کے بعد بھی کوئی مجھ سے زیادہ مستحق ہوسکتا ہے؟ میں صرف اپنی بے صبری ہی کی وجہ سے مستحق نہیں بلکہ ایک مینو نشین حُور بھی میرے لیے حیران و پریشان ہے۔

یہ گستاخانہ جُملہ سُنتے ہی سب چونک پڑے۔بعض حسین پر حملہ کرنے کو جھپٹے۔قریب تھا کہ اردگرد کے قوی ہیکل فدائی اس کی بوٹیاں اُڑا دیں کہ خورشاہ نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو روکا اور نہایت ہی متانت کے ساتھ حسین کا حال دیکھ کے بولا ''اس گستاخی اور بدتمیزی کی سزا میں تم سے کہا جاتا ہے کہ فوراً قلعے سے باہر نکل جاؤ۔تم اس لائق نہیں کہ فردوسِ بریں کی پاک زمین تمھارے قدم سے ناپاک کی جائے۔تمھاری سزا قتل تھی۔چند ایسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے میں تمھارے قتل کو مُناسب نہیں خیال کرتا۔مگر اب یہ نہیں ہوسکتا کہ تم اِس قلعے میں ایک گھڑی بھر کے لیے بھی ٹھہرنے پاؤ۔''

حسین کو فوراً اپنی گستاخی کا خیال آیا۔ایک بے اختیاری کی شان سے وہ زمین پر گر پڑا اور عاجزی

کے لہجے میں رو رو کے کہنے لگا ''یا امامَ قائمِ قیامت! میری خطا معاف ہو۔ میں جوشِ عشق میں بے اختیار و بے خود ہو گیا تھا''۔ لیکن بالکل شنوائی نہ ہوئی اور خور شاہ دیدار کو لیے ہوئے اپنے محل میں چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی لوگوں نے حسین کو زبردستی دھکے دے کے قعلے سے نکال دیا۔ اُس نے ہزار منّت سماجت کی مگر ایک پیش نہ کی گئی۔ بلکہ بعض لوگوں نے کہا کہ تم بڑے خوش نصیب تھے کہ صرف خارج البلَد کیے جاتے ہو ورنہ یہاں گستاخی کی سزا قتل ہے۔

حسین: پھر اب میں کیا کروں، اور کہاں جاؤں؟

لوگ: ہم نہیں جانتے۔ تمھیں اختیار ہے۔

حسین کی مایوسی کی اس وقت کوئی انتہا نہ تھی۔ صرف یہی نہ تھا کہ وہ زمّرد کے وصال سے مایوس ہو گیا ہو بلکہ اپنے آپ کو رحمتِ باری اور نجاتِ سرمدی سے بھی دور سمجھتا تھا۔ اس کے عقیدے میں تھا کہ جب میں اس درگاہ سے مرُدود ہو گیا تو پھر کہیں ٹھکانا نہیں ملے گا۔ غرض الُموت کے باہر پہاڑوں میں روتا ہوا اور چٹانوں سے سر ٹکراتا تھا۔ دل میں آئی کہ اپنے شیخ علی وجودی کے پاس جا کے اُن سے معافی کی درخواست کرے مگر خیال کیا اس بارگاہِ امامت سے نکالے جانے کے بعد وہ بھی اپنے ہاں پناہ نہ دیں گے۔ خیال ہر طرف لے جاتا اور ہر طرف سے مایوسی کے آثار نظر آتے ۔آخر اُسے زمّرد کی نصیحت یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی کوہِ اَلبرز کی گھاٹی اور زمّرد کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ یکا یک آپ ہی کہہ اُٹھا ''تو مجھے وہاں چلنا چاہیے۔ پس اب میرے لیے وہاں کے سوا اور کوئی پناہ کی جگہ نہیں۔'' مگر اس کے ساتھ ہی دل میں خیال گزرا کہ اب تو وہاں بھی مقدوری کی اُمید نہیں۔ جب اس نورستان اور سروِ شبستان سے میرے تعلقات مُطلقاً قطع کر دیے گئے تو وہ بھی مجھ سے ناخوش ہو گی۔ اور اگر بالفرض خوش بھی ہو اور وہ قدیم محبت اس کے دل میں باقی بھی ہو

تو یہ کیوں کر ممکن ہو گا کہ امام اور مُرشِد کے خلاف وہ مجھے کسی قسم کی مدد دے سکے۔ اب یہ بھی اُمید نظر نہیں آتی کہ پہلے کی طرح اور وعدے کے مطابق وہ مجھے کامیابی کا کوئی راستہ بتا سکے۔ یہ خیال کر کے وہ پُھوٹ پُھوٹ کے رونے لگا۔ بار بار دل میں آتی تھی کہ انھی پہاڑوں سے ٹکرا کے خود کشی کرے مگر اس میں اور زیادہ مایوسی کا یقین تھا۔ آخر اس نے دل میں یہی فیصلہ کیا چلو، زمّرد ہی کی قبر پر چل کے بیٹھوں۔ اگر دل کی اُلجھن زیادہ بڑھے گی تو اس حور وش کی قبر کو سینے سے لگالوں گا

۔

یہ فیصلہ کر کے وہ روتا اور سر دُھنتا ہوا پہلے قزوین گیا۔ پھر قزوین سے نکل کر کوہِ البرز کی اتنی پُرانی گھاٹی پر پہنچا اور وہیں مقیم ہو گیا۔ اتنے انقلاب، اتنی سرگردانی کے بعد اب پھر وہ معشوقۂ دلبر کی تُربت کا مجاوِر ہے۔ اسی طرح شب و روز عبادت و فاتحہ خوانی میں مصروف رہتا ہے۔ قبر کے پاس بیٹھ بیٹھ کے گھنٹوں زمّرد کے خیال سے باتیں کرتا ہے اور بار بار رو رو کے کہتا ہے ''اے مینونشین نازنین! خدا کے لیے اپنی قبر کی طرف توجّہ کر اور دیکھ کہ میں کیسا حیران و پریشان ہوں۔ آہ! تیرے عشق اور تیرے فراق کی بے صبری نے دونوں جہان سے کھو دیا۔ نہ اس دنیا ہی کے کام کا رہا اور نہ اُس عالم کے کام کا۔ او معشوقہ اور بارگاہِ لم یزل کی نازنین! میرے حالِ زار پر توجّہ کر۔ اس درگاہ میں میری شفاعت کر اور اپنی محبت کا صدقہ، مجھے اپنے وصل سے مایوس نہ رکھ۔''

یہی خیالات تھے جن کو وہ قبر کے سامنے ظاہر کرتا اور یہی دُعا تھی جو ہر وقت اُس کے لب پر تھی۔ آخر ایک دن اُس کی اُمید بَر آئی۔ صبح سویرے آنکھ کھول کر دیکھا تو قبر پر زمّرد کا خط رکھا ہوا تھا۔ ایک نہیں، بلکہ دو خط، جن میں سے ایک لفافے میں بند تھا اور دوسرا کھلا ہوا۔ حسین نے دونوں خطوں کو اُٹھا کے چُوما اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر کُھلے خط کو پڑھنے لگا، جس میں مضمون حسبِ ذیل

تھا:

حسین تو نے بڑی غلطی کی ۔ امامِ قائم قیامت کی خدمت میں اور گستاخی! غنیمت ہے کہ تو بچ گیا۔افسوس کہ میں اپنے دل کو تیری طرف سے نہیں پھیر سکتی ۔چند روز کے لیے یہاں آ کر تُو مُجھے اور بے تاب کر گیا۔اور اسی بے تابی کا نتیجہ ہے جو میں تجھے خط لکھ رہی ہوں ۔افسوس! میں وہ کام کرنے پر آمادہ ہوگئی جو مجھے کرنا نہ چاہیے تھا۔مگر مجبوری تھی ۔جو بات ہونے والی تھی کیوں کر رُکتی ۔ خیر،اب تو مستعدی سے میری تدبیر پر کاربند ہو۔مگر یہ سمجھ لے کہ یہ بہت ہی نازک کام ہے، جسے ضبط و تحمّل سے انجام دینا چاہیے ۔اگر تو نے ذرا بھی میرے مشورے کے خلاف عمل کیا تو تجھے ضرر پہنچے گا اور پھر ہم کبھی نہ مل سکیں گے ۔ یہ آخری اور سخت تدبیر ہے اور اس کے عمل کے لانے پر میں اس وقت مجبور ہوئی ہوں جب یہ یقین ہوگیا کہ تیرے لیے اب اُمید اور آرزو کے سب دروازے بند ہو گئے ۔ یہ دوسرا خط تجھے اس خط جو کے ساتھ ملے گا اور بند ہے، اسی طرح بند رکھ۔اس کو لے کے مشرق کی طرف روانہ ہو اور سیدھا شہرِ قراقرم میں جو کاشغر کے قریب ہے، پہنچ ۔وہاں مُغلوں کی شاہی خاندان میں ایک ملکہ ہے، بلغان خاتون ،اُس سے تنہائی میں ملنے کی کوشش کر اور میرا یہ خط اُسے دے دے ۔ اِس امر کی کوشش نہ کر کہ اس میں کیا لکھا ہے اور نہ اس امر کو بلغان خاتون سے پوچھنا۔وہ تجھ سے جو سوال کرے، بس اس کا صحیح جواب دے دے اور ملکہ بلغان خاتون جس امر کا ارادہ کرے، اس میں اس کی پیروی کر۔اگر وہ تیرے ساتھ آنا چاہے تو اُسے اور جو لوگ اس کے ساتھ ہوں، ان سب کو میری قبر پر لا کر کے کھڑا کر دے ۔ بلغان خاتون غالباً تجھ سے اخلاق سے پیش آئے گی اور یقین ہے کہ اپنی قوم کے ایک لشکر کے ساتھ اِدھر آنے کا ارادہ کرے گی ۔تُو خوشی سے اس کی رہبری کرنا اور منتظر رہ کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے ۔

تیری دلدادہ زمُرد۔

حسین یہ خط پڑھتے ہی فوراً قراقرم کی طرف چل کھڑا ہوا۔ راستے میں بار بار اُس کے دل میں آتا تھا کہ مجھے وہاں بھیجنے سے زمّرد کی کیا غرض ہے؟ مگر اُس کو وہ خود ہی مٹاتا اور کہتا کہ ان معاملات کے تجسُس سے زمّرد نے منع کیا ہے، تاہم ایک چیز کی اسے بڑی فکر تھی۔ وہ یہ کہ زمّرد نے ملکہ کو سوالوں کا سچ سچ جواب دینے کی ہدایت کی ہے اور میں ایسے کام کر چکا ہوں جن کے ظاہر کرنے میں ہر جگہ جان کا اندیشہ ہے۔ کیا یہ بتادوں کہ میں نے امام نجم الدین نیشاپوری کے بے خطاو قصور قتل کیا؟ یا امام نصر بن احمد کی نماز پڑھنے میں جان لی؟ اور سب باتیں درکنار وہاں تو شاید اگر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مجھے فرقۂ باطنیہ سے کوئی تعلق ہے تو واجبُ القتل قرار دیا جاؤں گا۔ کئی مہینے جو منازلِ سفر طے کرنے میں صرف ہوئے، انھی خیالات اور اسی قسم کے تر ددات میں گزرے۔ آخر وہ چلتے چلتے ترکستان کی حدود میں داخل ہو گیا اور چند روز بعد خاص شہر قراقرم میں وارد ہُوا جو تاتاریوں کا پایۂ تخت تھا۔ قراقرم میں پہنچ کے بھی کئی مہینے گزر گئے مگر شہزادی بلغان خاتون تک رسائی نہ ہوئی جس کے حسن و جمال کے قصّے سارے شہر میں مشہور تھے اور کہا جاتا تھا کہ اپنے باپ کے مارے جانے کے صدمے سے تمام لذائذِ دُنیوی سے علیحدہ ہو گئی ہے۔ آبادی سے باہر اس کا ایک باغ تھا جس میں ایک وسیع اور دلچسپ شکار گاہ بنی ہوئی تھی۔ مگر باپ کے غم نے ایسا پژمُردہ کر دیا تھا کہ اُس نے اب اس باغ میں آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن حسین وسطِ شہر میں کھڑا تھا کہ ناگہاں غُل ہوا ''شہزادی بلغانِ خاتون آئی ہے۔'' وہ سڑک کے کنارے ٹھہر گیا اور زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا تھا کہ ملکہ کئی سہیلیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار آئی اور نکل گئی حسین شاید جرأت کر کے اور جان پر کھیل کے ساتھ میں خط دے دیتا مگر زمّرد نے تاکید کی تھی کہ تنہائی میں دینا۔ مایوسی کی

صورت بنائے خاموش کھڑا رہ گیا اور جب شہزادی نکل گئی تو دل میں کہنے لگا ''یہ تو مشکل نظر آتا ہے کہ اس نازآفرین ملکہ کی خلوت گاہ تک رسائی ہو۔''

چند روز اور گزر گئے۔اب سُنا گیا کہ شہزادی نے مدّت کے بعد باغ اور شکار گاہ میں جانے کا ارادہ کیا ہے۔حسین کو اُمید پیدا ہوئی کہ غالباً وہاں موقع مل جائے گا۔اسی خیال سے پہلے ہی جا کے شکار گاہ میں چُھپ رہا۔وہاں بھی ملکہ بلغان خاتون آئی اور چپکے سے ہی چلی گئی۔حسین کو موقع ملنا تھا نہ ملا۔کئی دفعہ وہ ملکہ سے دوچار ہوا مگر ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی سہیلی ضرور موجود ہوتی تھی۔

جب حسین کو زیادہ مایوسی ہوئی تو آخر تدبیر یہ کی کہ نوکری کا اُمیدوار بن کے ملکہ کی ڈیوڑھی پر پہنچا اور ملازمت کی درخواست کی۔اتنے دن قراقرم میں رہ کے اس نے چند ایسے دوست بھی پیدا کر لیے تھے جنھوں نے اس کی سفارش کی اور اُسے بہ دُشواری ملکہ کو داروغۂ اصطبل ہونے کی عزت حاصل ہوگئی۔اس نوکری کے بعد بھی دو مہینے تک اُسے تنہائی میں ملنے کا موقع نہ ملا۔آخر ایک مرتبہ صبح سویرے جب کہ ملکہ اپنے بسترِ ناز سے اُٹھ کر غُسل خانے میں جا رہی تھی اور بالکل اکیلی تھی، وہ سامنے آ گیا اور جھک کر سلام کیا۔بلغان خاتون حسین کو غیر معمولی طور پر سدِ راہ دیکھ کے ٹھہر گئی اور پوچھا ''کیوں؟ کیا بات ہے؟''

حُسین: (زمین چوم کے) شہزادی کی خدمت میں ایک خط پہنچانا ہے، جس کو لیے ہوئے چھ مہینے سے قراقرم میں پھر رہا ہوں اور صرف اس وجہ سے کہ بغیر تنہائی کے مجھے اِس خط کے پیش کرنے کی اجازت نہ تھی، اتنی تاخیر ہوئی۔اِسی غرض کے لیے مجبوراً میں نے شہزادی کی ملازمت اختیار کر لی۔بڑی بڑی نامرادیوں کے بعد خوش نصیبی سے اس خط کے پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔'' یہ کہہ کہ اُس نے زمّرد کا خط نکال کر شہزادی کی طرف بڑھایا۔

شہزادی بلغان خاتون تاتاری عورتوں میں ہی نہیں، تاتاری رؤسا کے بھی خلاف ایک نہایت ہی شائستہ اور تعلیم یافتہ ملکہ تھی۔ وہ فارسی زبان میں بے تکلّف گفتگو کرتی تھی۔ اس قدر نہیں بلکہ شعرائے فارس کے کلام کی اچھی طرح داد دے سکتی تھی، اور مشکل اور بلیغ فارسی کو بوجہ احسن سمجھ لیتی تھی۔ خط کو ہاتھ میں لیتے ہی اس نے غور سے دیکھا، پھر لفافے کو سادہ پا کے تعجّب سے حسین کی صُورت دیکھی اور پُوچھا "یہ خط کس نے بھیجا ہے؟"

حُسین: شہزادی کو پڑھنے کے بعد خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ خط کسی انسان کا نہیں بلکہ ایک حُور کی طرف سے ہے جس کا نشیمن اُس سروِ شبستان اعلیٰ اور حیّزِ نور میں ہے۔

بلغان خاتون نے یہ جواب سُن کے اور حیرت زدہ ہو کے حسین کی صُورت دیکھی اور پوچھا "اگر فردوسِ بریں کی کسی حُور کا خط ہے تو تم کو کیوں کر ملا؟ اور تم سے اس کا کیا تعلق؟

حُسین: بس اتنا ہی تعلق ہے کہ اُس کی یاد میں سر دھنتا ہوں اور کبھی کبھی وہ کوئی خط کسی روحانی ذریعے سے میرے پاس پہنچا دیتی ہے۔

تاتاری شہزادی یہ جواب سُن کے اور متحیر ہوئی اور دیر تک حسین کو غور سے دیکھتی رہی۔ پھر دل میں سوچ کر بولی "اچھا، اب اِس وقت تم جاؤ۔ اس خط کو اطمینان سے پڑھ کر میں تم کو بلاؤں گی۔"

حُسین: (سینے پر ادب سے ہاتھ رکھ کے) بہتر مگر اتنا خیال رہے کہ اس بارے میں جو کچھ دریافت فرمانا ہو، شہزادی اسی طرح تنہائی میں بُلا کے دریافت فرمائیں۔ میں اپنے راز کو کسی اور کے سامنے صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتا۔

بلغان خاتون: میں اکیلی ہی ملوں گی۔

یہ خط اور حسین کا بیان معمولی چیزیں نہ تھیں۔ شہزادی بلغان خاتون نہانا بھی بھول گئی اور حسین کے واپس جاتے ہی پھر اپنی خواب گاہ کی طرف پلٹ گئی۔ تنہا بیٹھ کے خط کو کھولا اور نہایت توجّہ اور مُستعدی سے پڑھنے لگی۔

مضمون حسبِ ذیل تھا:

''او غمزدہ اور نیک دل شہزادی! تُو اپنے باپ کے غم میں مبتلا ہے جو باطنیین کے فدائی دیدار کے ہاتھوں سے نہایت دغا بازی کے ساتھ قتل ہوا۔ مجھے تیرے رنج والم سے ہمدردی ہے۔ اِسی لیے اپنے منصب کے خلاف تجھے خبر دیتی ہوں کہ دیدار یہاں قلعۂ الموت میں بیٹھا جنت کے مزے لوٹ رہا ہے۔ اگر اپنے باپ کا انتقام لینا چاہتی ہے، اگر دنیا کے پردے سے ایک بہت بڑا فتنہ دُور کرنا چاہتی ہے تو اِسی حسین کے ساتھ جو میرا خط لایا ہے اور جو جنت کی زیارت کے شوق میں عقل و ہوش بلکہ دین و ایمان کھو چکا ہے، کوہِ البرز کی وادی میں میری تُربت پر آ کے پتھر کو اُلٹ۔ اس کے نیچے تو میرا دوسرا خط پائے گی جو تیری رہبری کرے گا اور تو اپنے باپ کے انتقام کے ساتھ ایک بڑے طلسم کو توڑ کے دنیا کا سب سے بڑا راز کھولے گی۔ اُس وقت تجھے معلوم ہو جائے گا کہ دنیا اور ملاءِ اعلیٰ میں کتنا فرق ہے۔ حسین سے تو اس کے حالات پوچھ سکتی ہے جس سے تجھے معلوم ہو گا کہ اس کے دل پر فردوسِ بریں کا کتنا اثر ہے۔ جہاں میں ہوں یہی جنت میں تجھے بے منّت دکھاؤں گی اور تیرا مجرم تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ لہٰذا آ اور جلدی آ۔ مگر خیال رہے کہ ۲۷ رمضان کی صبح کو میری تُربت پر موجود ہو۔ اِس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کافی تعداد میں ایک تاتاری لشکر تیرے قریب ہی موجود رہے لیکن میری قبر پر تجھے اپنے ساتھ میں چار آدمیوں سے زیادہ کو نہ لانا چاہیے۔ مینونشین زمرّد۔''

بلغان خاتون کے حق میں یہ خط کسی جادو یا تسخیر کے حکم سے کم اثر نہ رکھتا تھا، جس کو پڑھتے پڑھتے کبھی وہ انتہا سے زیادہ غضب ناک ہو جاتی اور کبھی خاص خیال سے اس کے دل کو یک گونہ تسکین ہو جاتی۔ مگر حیرت واستعجاب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے خط کو اوّل سے آخر تک کئی مرتبہ پڑھا اور کچھ سوچنے لگی۔ آخر بہت دیر کے لیے تردّد اانتشا کے بعد اُس نے حسین کو اپنے سامنے بُلایا اور پوچھنے لگی ''تم جانتے ہو اس خط میں کیا لکھا ہے''؟

حُسین: نہیں۔ مجھے ایک لفظ کی بھی خبر نہیں۔

یہ جواب پا کر بلغان خاتون نے تجسّس کی نگاہ سے حسین کو گھور کے دیکھا اور پُوچھا ''تم مذاہبِ باطنیہ کے پابند ہو؟''

حُسین: (ڈر کے) جی ہاں۔

بلغان خاتون: تم نے جنت کی سیر کی ہے؟

حُسین: ایک بار دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔

بلغان خاتون: اچھا، تمھاری یہ ہوس پوری ہو جائے گی، مگر یہ بتاؤ، تمھارے شمار فدائیوں میں ہے؟

حُسین: البتہ۔

یہ جوب سُن کر بلغان خاتون پھر حسین کو گھور کے دیکھا اور پوچھا ''تم نے کتنے لوگوں کی جان لی ہے ''؟

حُسین: صرف دو شخصوں کی۔ مگر بڑے بڑے شخص، جن کے قتل کرنے کا مجھے بھی افسوس ہے۔

بلغان خاتون: اُن پر خنجر چلاتے وقت تمھیں ترس نہ آیا؟

حُسین: آیا تھا مگر مُرشد کے حکم سے انحراف نہیں کر سکتا تھا۔

بلغان خاتون: (تعجب سے) مُرشد کے حکم سے اتنے بڑے ارتکاب کر لینے میں تمھیں اپنے نیک وبد کا خیال نہیں آیا؟

حُسین: نیک وبد ہمیں نظر ہی کب آتا ہے۔ ہم ہر چیز کے ظاہر کو دیکھتے ہیں اور شیخ کی نگاہیں باطن پر، یا یوں کہنا چاہیے کہ اصلی حقیقت پر پڑتی ہیں۔

بلغان خاتون: اگر مُرشد گرنے کو کہے تو گر پڑو گے؟

حُسین: بلا تامُّل! یہی ہمارا عقیدہ اور پہلی ریاضت ہے۔ مُرشد جس خوبی کو دیکھ کے حکم دیتا ہے، اُس کے سامنے اس بُرائی یا مَضرت کی کوئی ہستی ہی نہیں۔

بلغان خاتون: زمّرد کی تم سے کیوں کر مُفارقت ہوئی؟

حُسین: میں منع کرتا رہا، اُس نے نہ مانا اور کوہِ البرز کی اس گھاٹی میں چلی گئی جہاں کبھی کبھی پریوں کا گزر ہوتا ہے۔ ہمارے جاتے ہی پریاں بھی آ پہنچیں۔ انھوں نے آتے ہی اُسے مار ڈالا اور اُس کی وہاں قبر بنا دی جس پر مُدّتوں میں آہ وزاری کرتا رہا۔ شہادت نے زمرد کو فردوسِ بریں میں پہنچا دیا اور میں قبر پر پڑا موت کا منتظر تھا کہ زمرد نے فردوسِ بریں سے خط بھیج کے مجھے فرقۂ ناجیۂ باطنیہ میں داخل ہونے کی ہدایت کی اور اپنے پاس پہنچنے کا طریقہ بتایا، اُس کی ہدایتوں کے مطابق عمل کر کے میں ایک بار اُس کے دیدار سے شرف یاب ہو چکا ہوں۔ مگر افسوس پھر ملنے کی اُمید نہیں۔ اب دوبارہ کوشش اس کی زیارت کے لیے آپ کے ذریعے سے شروع ہوئی ہے مگر چونکہ مجھے کچھ پوچھنے کی اجازت نہیں۔ لہٰذا آپ کے سامنے میں اپنی کوئی آرزو پیش نہیں کر سکتا۔

بلغان خاتون کو حسین کی اس سادہ مزاجی پر حیرت ہوئی۔ وہ کسی قدر مسکرائی اور کہا:

''بے شک میں اپنی آرزو میں بامراد ہوں گی اور تمھاری تمنّا بَر آئے گی۔ لیکن مجھے بھی اُس مقام

تک پہنچادو جہاں زمّرد کی قبر ہے اور جس جگہ تم کہتے ہو کہ وہاں پریوں کا نشیمن ہے''۔

حُسین: اس امر کا تو مجھے حکم ہو چکا ہے۔شہزادی جب تشریف لیں چلیں' یہ غلام ہمرکاب ہو گا۔

بلغان خاتون: حسین اگر میں کسی کو قتل کرنے کا کہوں تو تم اسے قتل کر ڈالو گے؟

حُسین: بے شک' بشرطیکہ اسے قتل کرنے میں کچھ مضائقہ نہ ہو۔

بلغان خاتون: یہ قید تم مُرشد سے بھی لگاتے ہو؟

حُسین: نہیں۔مُرشِد کے تعلقات مُرید کے ساتھ اور قسم کے ہیں۔ان کے ہاتھ میں مُرید کو ایک بے جان آلے کی طرح رہنا چاہیے۔

بلغان خاتون: خیر' اب تو میں سفر کا سامان کرتی ہوں۔تم بھی تیار رہو۔

یہ کہہ کے شہزادی نے حسین کو رخصت کیا اور خود حمام میں گئی۔مگر اُس کی حیرت کسی طرح کم ہونے کو نہ آتی تھی۔لوگ اُس کے مزاج میں کوئی غیر معمولی تغیر پاتے تھے جس کے متعلق ہر شخص سوال کرتا مگر وہ خاموش رہتی۔

دوسرے دن اُس نے علی الصبّاح ایک سانڈنی سوار کو خط دیکر کسی طرف روانہ کیا اور خود بھی روانگی کا سامان کرنے لگی۔مگر اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ اپنے ابنِ عَم اور شہنشاہِ تُرکستان منقو خان سے اجازت حاصل کرے جس کے لیے وہ ایک تردّد میں تھی۔

ساتواں باب

بلغان خاتون کا سفر

جس روز حسین نے اپنی مینونشین معشوقہ زمّرد کا خط بلغان خاتون کو پہنچایا ہے، اُس کے ایک ہفتے کے بعد صبح کے وقت تا تاری شہزادی اپنے بھائی منقو خان کے پاس گئی۔ منقو خان کے دربار میں اُس وقت خاندانِ تا تاری کے کئی معزّز روٴسا موجود تھے جن کے سامنے وہ کہتے ہوئے جھجکی اور دیر تک خاموش بیٹھی رہی ۔اُس کو چُپ دیکھ کے منقو خان نے کہا ''یہ غیر معمولی سکوت کیسا؟''

ایک درباری: شہزادی اپنے والد کے غم کو آج تک نہیں بھُولیں ۔

منقو خان: ہاں، بلغان! اب تو اس غم کو چھوڑ دو۔ اتنے دنوں تک غم والم میں مبتلا رہنا ہماری قومی شجاعت کے خلاف ہے۔

بلغان خاتون: آہ بھائی! یہ غم بھول سکتا ہے؟ (تھوڑے سکوت کے بعد) خیر۔اب باتیں تو ہوتی رہیں گی، اس وقت میں ایک ضروری کام کو آئی ہوں۔

منقو خان: وہ کیا؟

بلغان خاتون: بھائی! آپ نے تو بہت سی مُہمیں سر کیں مگر اب ارادہ ہے کی ایک مُہم کو میں خاص اہتمام کے ساتھ اپنے ہاتھ سے انجام دوں۔

اِس جُملے کو سُنتے ہی سب لوگ حیرت میں آ گئے۔ منقو خان نے اُسے گھور کے دیکھا اور پوچھا '' بہن! خیر تو ہے؟ کیسی مُہم! کیا میرے اسلحہ نے جواب دے دیا ہے؟ فقط تمھارے کہہ دینے کی ضرورت ہے۔ جس ملک یا جس قوم کو کہو' میرے جانے کی بھی ضرورت نہیں' ہمارے بہادُر سپاہی جائیں گے اور ایک آن میں تہ و بالا کر دیں گے۔

بلغان خاتون: یہ صحیح ہے، مگر میں چاہتی ہوں کہ اس کام کو خاص اپنے ہاتھ سے انجام دوں۔

منقو خان: آخر کون سا کام ہے، اور کس پر فوج کشی کا ارادہ ہے؟

اِسکے جواب میں بلغان خاتون نے زمّرد کا خط اُسکے سامنے رکھ دیا اور کہا ''پہلے اسے پڑھ لیجیے، پھر پوچھیے گا۔'' منقو خان نے خط کو اوّل سے آخر تک پڑھا لیکن ختم کرنے سے پہلے ہی اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اُس نے غضب آلود چشم اور زخم شدہ ہونٹوں سے خط کو تمام کر کے غصّے سے پھینک دیا اور کہا ''مطمئن رہو۔ میں کل ہی ہلاکو خان کو لکھتا ہوں۔''

بلغان خاتون: نہیں۔ یہ میرا کام ہے۔

منقو خان: تم جا کے کیا کرو گی! جنگ و پیکار تُمھارا کام نہیں۔

بلغان خاتون: اسی خیال کو میں دنیا سے مٹا کے ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ عورتیں بھی ویسی ہی بہادر ہیں جیسے مرد۔ اگر موقع دیا جائے تو کسی امر میں مردوں سے کم نہیں رہیں گی۔ اور ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہاں لڑنے کی ضرورت ہو گی یا نہیں۔

منقو خان: بے شک ہو گی۔ بغیر اس کے کامیابی ممکن نہیں۔ باقی رہی عورتوں کی شجاعت، میں تسلیم کرتا ہوں کہ عورتوں کی حکومت مردوں سے بڑی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے تاجدار اور بڑے بڑے صف شکن جو عالم کے تخت اُلٹ دیتے اور ساری دنیا کے بہادروں کے دست و بازو تھکا دیتے ہیں، ان پر بھی جو حکومت کرتا ہے، وہ عورت ہے۔ مگر عورت کے اسلحہ دوسرے ہیں۔ وہ تیر اور خدنگ، شمشیر و خنجر سے نہیں لڑتی بلکہ اپنے حریفوں پر تیر

بلغان خاتون نے اس جواب پر شرمندہ ہو کے سر جھکا لیا۔ مگر نیچی نظروں میں اس نے پھر متانت پیدا کی اور کہا ''بھائی! ایسا نہ سمجھیں۔ میں اسی طرح بہادری اور جان بازی سے مقابلہ کروں گی جس

طرح کسی بہادُر تاتاری لڑکی کو کرنا چاہیے۔

منقو خان: یہ میں جانتا ہوں مگر جس وقت تک ہم لوگ زندہ موجود ہیں تم سی نازنین کو میدانِ جنگ میں قدم رکھنے کی زحمت نہیں دی جاسکتی ۔اور آخر تمھارے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

بلغان خاتون: یہ صرف میرا کام ہے اور اپنے فرض سے میں آپ ہی سُبک دوش ہونا چاہتی ہوں۔

منقو خان: خیر ایسا ہی شوق ہے تو چلو۔مگر میں بھی ساتھ چلوں گا۔یہ مجھ سے گوارا نہیں ہوسکتا کہ خاندانِ مغلیہ کی ایک معزّز شہزادی اپنے نامور عزیزوں کے ہوتے ہوئے تنِ تنہا میدانِ کار زار میں قدم رکھے۔

بلغان خاتون: مگر بھائی! وہاں کسی لڑائی کی اُمید نہیں۔ ہمارے چند سپاہی بھی ہوں گے تو کامیاب ہوجائیں گے۔

منقو خان: یہ نہ سمجھو۔جو لوگ سردار کے ایک ادنیٰ اشارے پر جان دینے کو تیار ہوجائیں،اُن سے ڈرنا چاہیے۔

بلغان خاتون: مگر تاتاریوں کا رُعب آج کل دلوں پر اس قدر بیٹھا ہوا ہے کہ میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ وہ لوگ بے لڑے ہتھیار رکھ دیں گے۔

منقو خان: بے شک ہمارا ایسا ہی رُعب ہے۔مگر پھر بھی ایک قدیم اور ڈیڑھ سو برس کے شاہی و مذہبی خاندان کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دینا آسان کام نہیں۔

منقو خان دیر تک اِصرار کرتا رہا۔جب شہزادی بلغان خاتون نے اس کی شرکت کسی طرح گوارا نہ کی اور دیکھا کہ بھائی منظور نہیں کرتا تو جھک کے اُس کے کان میں کچھ کہا جسے سُن کے وہ تھوڑی دیر تک غور کرتا رہا اور آخر بڑی دیر کی بحث وتکرار کے بعد یہ قرار پایا کہ اُولُو العزم و بہادُر تاتاری شہزادی

پانچ سو سوار ساتھ لے کے روانہ ہو جائے۔ بلغان خاتون واپسی کے لیے اُٹھتے اُٹھتے بیٹھ گئی اور خط کو دوبارہ بھائی کے سامنے پیش کر کے بولی:

''مگر ذرا دیکھ کے یہ بھی بتلا دیجیے کہ مجھے کب یہاں سے روانہ ہونا چاہیے؟ زمرّد نے کس تاریخ کو بُلایا ہے؟''

منقو خان: (خط کو پڑھ کے) رمضان کی ۲۷ تاریخ۔

بلغان خاتون: خدا جانے اِس تاریخ کے معین کرنے سے کیا غرض ہے۔ تو پھر مجھے کُوچ کر دینا چاہیے۔

منقو خان: اِس میں کوئی بات ضرور ہے اور میری سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا کہ اُس گھاٹی میں پہنچنے کے بعد تمھیں کیا پیش آئے۔ ممکن ہے کہ اُس عورت نے جو اپنے کو حور بتاتی ہے، فریب کیا ہو؟

بلغان خاتون: اس کی تحریر اور اس کی بے تکلفانہ دعوت سے مجھے فریب کی اُمید نہیں۔ باوجود اس کے محض اسی خیال سے میں نے تھوڑے سے سپاہی ساتھ لے جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ اپنی حفاظت کا میں نے پورا بندوبست کر لیا ہے۔ ہاں، تو زمرّد نے رمضان کی ۲۷ کو بُلایا ہے اور آج کون تاریخ ہے؟

منقو خان: جمادی الاوّل کی ۲۰۔ قریب قریب چار مہینے سے کم کا نہیں۔ اگر جلدی پہنچ گئیں تو راستے میں کسی جگہ ٹھہر جانا مگر جانا ہے تو کل ہی کوچ کر دینا چاہیے۔

اِس کے بعد منقو خان کچھ آپ ہی سوچ کر بولا ''ہاں خوب یاد آیا۔ بلغان خاتون' ایک دو دن اور ٹھہر جاؤ۔ آج سے چوتھے دن ہلاکو خان کی کمک کو چالیس ہزار سپاہیوں کا بڑا بھاری لشکر جانے والا ہے جس کو طوبی خان لے جائے گا۔ اُس کے ساتھ تم بھی ہو لینا۔ یہ لوگ بھی اُس طرف جائیں

گے جدھر تم جاتی ہو۔ بلکہ انھیں تم سے آگے جانا ہے۔ ہلاکو خان ویلم کے تخت پر قبضہ کر چکا ہے۔ فی الحال اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس فوج کے پہنچنے کے بعد وہ ارض عراق کا عزم کرے گا، اور ارادہ ہے کہ خلیفہ بغداد کو بھی اُس کی سرتابیوں اور غرور کی سزا دی جائے۔

بلغان خاتون: ایک دن کی بات ہے تو میں ٹھہر جاؤں گی۔

اِن تمام اُمور کا تصفیہ کر کے بلغان خاتون اپنے مکان پر واپس آئی اور حسین کو بُلا کے کہہ دیا ''پرسوں کُوچ ہے۔ تیار رہنا۔'' حسین نے سینے پر ہاتھ رکھ کے اور ادب سے سر جھکا کے جواب دیا ''مجھے تو جس وقت حکم ہو' حاضر ہوں۔''

دوسرے روز منقو خان کا بیٹا طُوبی خان بھی کوچ کا سامان کرنے لگا اور اس کے ساتھ کے لیے چالیس ہزار جوانوں کو تیاری کا حکم دیا گیا۔ آخری رات سپاہ نے عجیب ذوق وشوق اور بڑی دھوم دھام میں بسر کی۔ قراقرم کے درودیوار سے جوش وخروش نمایاں تھا۔ ہر طرف ایک چہل پہل تھی۔ لوگ اِدھر اُدھر دوڑے پھرتے تھے۔ جو اپنے گھروں اور خیموں میں تھے، وہ خوشی خوشی اسلحہ بھی دُرست کرتے جاتے تھے اور عزیزوں، بیوی بچوں سے بھی رخصت ہوتے جاتے تھے۔ صبح سویرے ہی کوچ کا طبل بجا اور تاتاریوں کے غول اپنے اپنے نشانوں اور بیروں کے نیچے جوشِ مسّرت میں کودتے۔ اپنے قومی گیتوں کو گاتے اور شور کرتے ہوئے بڑھے۔

یہ فوج مختلف حصوں میں تقسیم ہو کے روانہ ہوئی۔ ہراول کے پانچ ہزار جوان آگے بڑھ گئے۔ پھر جاں نثاروں کی پانچ پانچ ہزار ٹکڑیاں داہنے بائیں پھیل گئیں۔ پانچ ہزار کا ایک گروہ پیچھے غول میں رہا اور درمیان یا قلب میں پورے ۲۰ ہزار ترک جدا جدا فوجوں اور پرچموں میں بٹے ہوئے آگے پیچھے روانہ ہوئے، جن کے بیچ میں طُوبی خان اور بلغان خاتون دو مضبوط گٹھے ہوئے ترکی گھوڑوں

پر سوار تھے۔تاتاری کمانیں اور نیزے چاروں طرف حلقہ کیے ہوئے تھے اور ہر چہار طرف سے جوش ولولے کی صدائیں اور فتح ونصرت کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔تاتاریوں کا یہ طوفان ایک ٹڈی دَل کی طرح راستے کی تمام چیزوں کو خراب کرتا چلا جاتا ہے جو گاؤں نظر آتا، آدمیوں سے خالی ملتا۔اس لیے کہ ان بے رحم وجری لُٹیروں کی آمد کی خبر سُنتے ہی لوگ اپنے اپنے گھر چھوڑ کے بھاگ جاتے اور اُن کے ویران اور غیر آباد مکانوں میں آگ لگا دی جاتی۔یہ لوگ جُوں جُوں آگے بڑھتے، شہر اور گاؤں مسمار و مُنہدم اور جل جل کر خاک سیاہ ہوتے جاتے۔رعایا میں سے مرد، عورت، بوڑھا، بچہ جو شخص ملتا، انسان کا شکار کھیلنے والے وحشیوں کے ہاتھ سے قتل ہوتا۔یہ لوگ تمام علاقے میں خلقِ خدا کو تباہ کرتے ہوئے بحرِ خزر کے کنارے کنارے چلے اور مازندران میں پہنچے۔پھر اُن کے گاؤں تاخت وتاراج کر کے آذربائیجان کی طرف نکل گئے۔اس لیے کہ ہلا کو خان کے اسی طرف ہونے کی خبر تھی کیونکہ وہ سلطانِ ویلم کے تعاقب میں شمال کی طرف بڑھ گیا تھا

۔

مگر بلغان خاتون اپنے ساتھ کے پانچ سو سواروں کے ساتھ جبلِ طالقان کے دامن میں نہر ویر نجان کے قریب خیمہ زن ہو گئی (عین اسی مقام پر جہاں اس ناول کی ابتدا میں ہم نے زمّرد اور حسین کو پایا تھا۔)

جس وقت یہ پانچ سو تاتاری اُس سرزمین پر پہنچے ہیں، رمضان کی ۱۸ تاریخ تھی۔مجبوراً چند روز اسی جگہ فروکش رہنا پڑا، جس سے زیادہ کوئی مصیبت تاتاری لشکر کے لیے نہیں ہو سکتی تھی۔ان لوگوں کا معمول تھا کہ جب تک لُوٹتے مارتے رہتے، اسی وقت تک اچھے اور خوشحال رہتے اور جہاں کسی جگہ قیام ہو گیا، محض اس وجہ سے کہ نئے شہر اور قصبے اُن کو نہ ملتے، فاقے کرنے لگتے۔یہاں بھی یہی

مجبوری تھی ۔سب نے انتظار کر کے دن فقر و فاقے سے بسر کیے۔نویں دن ٹھیک ۲۷ تاریخ تھی ۔ بلغان خاتون صبح ہی سے کسی انتظار میں تھی اور جُوں جُوں دیر ہوتی ،اُس کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی ۔ آخر جب اس نے دیکھا کہ وقت نکلا جاتا ہے تو پس وپیش کے بعد تین فوجی جوانوں کو ساتھ لے کے چل کھڑی ہوئی ۔حسین اُس کا رہبر ہوا۔ باقی تمام ہمراہی وہیں چھوڑ دیے گئے۔ حسین اور تاتاری شہزادی سڑک چھوڑ کے نہر ویرنجان کے کنارے کنارے چلےاور بدقت ودشواری گھاٹیوں اور جنگلوں سے گُذر کے اُس مَرغزار میں جا پہنچے۔ حسین نے زمّرد کی قبر پر جا کے فاتحہ خوانی کی اور کہا''یہی پتھر ہیں جن کے نیچے میری زمّرد کا پیکرِعنصری آرام کر رہا ہے۔''

بلغان خاتون نے زمّرد کا خط نکال کر پھر پڑھا اور زمّرد کی ہدایت کے موافق قبر کے پتھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے ہٹانے لگی ۔چار پانچ پتھر ہی ہٹے ہوں گے کہ حسبِ وعدہ زمّرد کا دوسرا خط مل گیا جسے کھول کے اُس نے چپکے چپکے پڑھا اور ذرا مُتر دّد ہو کے سامنے کی طرف نظر بڑھا بڑھا کے دیکھنے لگی ۔چند لمحوں کے بعد کچھ سوچا اور اپنے ایک ہمراہی کے کان میں کچھ کہنے کو جھکی ۔تاتاری سپاہی شہزادی کا راز سُنتے ہی واپس روانہ ہوا اور وہ خود حسین کی طرف دیکھ کے بولی''چلو۔''

حسین: کہاں؟

بلغان خاتون: جہاں میں لے چلوں۔

اتنا کہتے ہی دونوں باقی ماندہ سپاہیوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور چل کھڑی ہوئی۔حسین کی کیا مجالِ انکار تھی ۔بے عُذر ساتھ ہولیا۔

بلغان خاتون اس وادی کے شمالی کونے کی طرف چلی ۔اُسی طرف جدھر سے حسین نے کبھی پریوں کو آتے دیکھا تھا۔جاتے جاتے تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ ایک سرسبز پہاڑ کے دامن میں پہنچی اور گو

اُس طرف کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا مگر وہ برابر بڑھتی چلی جاتی تھی ۔ حسین تو ایک عقیدت کیش مُرید کی شان سے بے عذر اطاعت کر رہا تھا مگر ہمراہی سپاہیوں کو حیرت تھی کہ شہزادی انھیں کہاں لیے جا رہی ہے۔ بلکہ ایک نے بڑھ کے ادب سے پوچھا بھی کہ اِدھر تو راستہ نہیں ہے۔ جس کے جواب میں بلغان خاتون نے کہا کہ تم کُچھ بولو چالو نہیں ۔ خاموشی سے چلے آؤ۔ پہاڑ کی جڑ میں پہنچ کے وہ ایک تیرہ و تار غار میں گھس گئی اور ساتھیوں سے کہا ''اس طرح چلو کہ کسی کو آہٹ معلوم نہ ہو۔'' شہزادی کے حکم کے مطابق سب لوگ جہاں تک ممکن تھا، آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے چلے۔ غار کے اندر بالکل اندھیرا تھا۔ سب ہاتھوں سے ٹٹولتے اور دونوں طرف کے ٹکروں سے بچتے جاتے تھے ۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد دور کچھ روشنی نظر آئی جس کی نسبت معلوم ہوا کہ غار کے اس طرف کا دہانہ ہے۔ آخر بلغان خاتون اس غار سے باہر نکلی ۔ مگر جب غار سے نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ مقام بھی وحشت ناک ہے اس لیے کہ یہاں بہت ہی گھنا جنگل تھا جس کے درخت اس طرح ملے ہوئے تھے کہ آفتاب کی روشنی بہ مشکل زمین تک پہنچ سکتی تھی ۔

شہزادی اس جنگل میں پہنچتے ہی بائیں ہاتھ کی طرف مُڑ گئی ۔ اب اس کا رُخ مغرب کی طرف تھا۔ وہ درختوں میں پھنستی اور کانٹوں میں الجھتی برابر آگے چلی جاتی تھی ۔ ساتھ والے اِس دشوار گزار راستے کو دیکھ کے گھبرا گئے تھے اور دل میں حیران تھے۔ آخر یہ جنگل یکا یک ایک پہاڑ کے پاس ختم ہو گیا۔ یہاں پہنچ کے شہزادی پھر داہنے ہاتھ کی طرف مڑی اور پہاڑ کے دامن ہی دامن میں دور تک چلی گئی ۔ ایک مقام پر پہنچ کے اسے نظر آیا کہ جیسے کسی ناگہانی صدمے کے باعث پہاڑ پھٹ گیا ہے اور درمیان میں ایک بہت ہی تنگ اور لمبی گلی پیدا ہو گئی ہے جس سے ایک سے زیادہ آدمیوں کا گزر نہیں ہو سکتا۔

بلغان خاتون نے اُس گلی کوغور سے دیکھا، چاروں طرف نظر دوڑائی اور جیسے دل ہی دل میں کچھ مطمئن ہو کے اُس گلی کے اندر گُھسی ۔اندر جانے سے پہلے اُس نے ایک اور ہمراہی سپاہی کے کان کی طرف جُھک کے کچھ کہا جس کے ساتھ ہی وہ واپس چلا گیا ۔اب شہزادی حسین اور باقی ماندہ ایک جوان کو ساتھ لے کے گلی میں داخل ہوئی ۔گلی کے اندر ایک مقام پر ایک کھڑکی ملی جسے شہزادی نے کھول کے دیکھا تو کپڑوں کا ایک زنانہ جوڑا تھا اور دو مردانے جوڑے جو بالکل دہقانوں اور گائے بھینس پالنے والوں کی وضع کے تھے ۔شہزادی نے دونوں جوڑے حسین اور دوسرے ساتھی کو دے کے کہا ''اپنے کپڑے اُتار کے یہاں رکھ دو اور یہ کپڑے پہن لو۔'' یہ کہہ کر وہ خود بھی زنانہ جوڑا پہننے لگی ۔ جب سب کپڑے پہن چکے تو گو یہاں اندھیرا تھا، حسین شہزادی کی وضع ولباس کو حیرت سے دیکھنے لگا ۔

بلغان خاتون: کیوں حسین! تعجب کس بات کا ہے؟

حسین: کیا عرض کروں ۔ یہ لباس پہن کے تو آپ دنیاوی شہزادی نہیں آسمانی حُور معلوم ہوتی ہیں ۔

بلغان خاتون یہ بات سُن کے مسکرائی اور بولی ''بس چپکے چپکے چلے آؤ۔'' اور آگے روانہ ہوئی ۔یکا یک معلوم ہوا کہ آڑی چٹان نے راستہ بند کر دیا ہے ۔ بلغان خاتون نے جب مڑ کے دیکھا تو نیچے ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آیا جس میں سے ایک آدمی مشکل سے سمٹ سمٹا کے نکل سکتا ہے ۔وہ اُسی سُوراخ سے نکلی اور ہمراہیوں کو بھی نکلنے کا حکم دیا ۔اِس دُشواری کو جھیل کے شہزادی آگے بڑھی، لیکن بظاہر ایک بہت بڑی مشکل نظر آئی ۔وہ یہ کہ آگے ایک زبردست فولادی دروازہ تھا جو دوسری طرف سے بند تھا ۔مگر بلغان خاتون نے دروازے کے داہنے بازو کے برابر سے ایک

پتّھر نکالا، جس کے ہٹتے ہی روشن دان سا ہو گیا۔ اس روشن دان میں ہاتھ ڈال کے اُس نے دروازے کی کنڈی کھولی۔ جو اندر سے بند تھی۔ اس کے بعد تاری سپاہی اور حسین کی زور آوری سے فولادی پٹ اندر کی طرف ہٹ آیا اور جانے کا راستہ بن گیا۔

اس دروازے سے نکلتے ہی بلغان خاتون نے حیرت سے دیکھا کہ عجب فرحت بخش روح افزا چمن لگے ہوئے ہیں۔ پھولوں کی بہار اور طیور کی نغمہ سنجیاں دیکھتے ہی بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا ''واہ!'' مگر حسین جو اس مقام کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے حیرت سے دیکھ رہا تھا، شہزادی کی زبان سے یہ لفظ سُن کے بولا ''مجھے تو یہ فردوسِ بریں معلوم ہوتا ہے۔ مگر کیوں کر کہوں۔''

بلغان خاتون: اب میں تمھیں حُور نظر آتی ہوں تو ضرور ہے کہ یہ باغ جنت ہے۔ مگر ذرا غور سے دیکھو۔

کیا یہی وہ فردوسِ بریں ہے جس کی تم سیر کر چکے ہو؟ (یہ کہہ کے شہزادی مسکرائی۔)

حُسین: بعینہٖ وہی مقام معلوم ہوتا ہے۔ خداوندا! میں خواب دیکھتا ہوں یا بیدار ہوں! اور دیکھیے طیور کے نغموں سے بھی وہی آواز نکلتی ہے۔ اَلسَّلَامُ عَلَیکُم طِبْتُم فَا دْخُلُوھا خالِدِیْن۔

بلغان خاتون: اس کے کیا معنی؟

حُسین: اللہ جلّ شانہٗ، نے قرآنِ پاک میں وعدہ کیا ہے کہ جنت میں لوگوں کا خیر مقدم ادا کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پر سلام ہو۔ پاک ہو گئے تم لوگ۔ لہٰذا ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

حسین نے زبان سے تو یہ جواب دے دیا مگر اُس کے دل و دماغ اور اس کی آنکھوں پر ساعت

بساعت زیادہ حیرت مستولی ہوتی جاتی تھی۔وہ ہر چیز کو گھبرا گھبرا کے دیکھتا اور بار بار کہہ اُٹھتا ''یا تو میں آسمان پر پہنچ گیا ہوں یا فردوسِ بریں نیچے اُتر آیا ہے۔ یہ تو بعنیہٖ وہی باغ ہے جس میں زمّرد کے ساتھ سیر کرتا پھرتا تھا۔''

بلغان خاتون: فردوسِ بریں میں تم پہنچ گئے۔اب مطمئن رہو۔زمّرد سے بھی ملوا دوں گی۔

حسین کو جنت میں پہنچ جانے کا یقین ہو گیا تھا۔شہزادی کی زبان سے یہ فقرہ سنتے ہی اُس کے قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا:

''آپ نے اِس راہ میں میری رہبری کی ہے۔ مجھے اب شیخ علی وجودی سے بھی دستگیری کی اُمید نہ تھی۔آپ کا یہ احسان ہمیشہ میرے لوحِ دل پر نقش رہے گا۔''

بلغان خاتون: (حسین کو زمین سے اُٹھا کے) ذرا صبر و تحمل سے کام لو۔زمّرد سے ملنے کے لیے شرط ہے کہ چپکے سے ساتھ ساتھ چلے چلو۔ایسا اضطراب کرو گے تو کام بگڑ جائے گا۔ یہ کہہ کے شہزادی نے پھر زمّرد کا خط نکال کے پڑھا اور دونوں ہمراہیوں کو ساتھ لیے ہوئے ایک جانب چل کھڑی ہوئی۔چند منٹ میں وہ قصروں اور کوشکوں کے قریب تھی۔

حسین اِس نظر فریب منظر کو کھڑا نہایت ہی حیرانی و ازخود رفتگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ناگہاں ایک حسین و نازنین عورت شہزادی کے سامنے آئی اور اُس کے پاؤں چومنے کو جھکی۔

بلغان خاتون: تم کون ہو؟ (مگر اس کے ساتھ ہی حسین کی نظر اس پر جا پڑی۔ایک بے اختیاری و خود فراموشی کے جوش میں اس کی زبان سے نکلا ''زمّرد!'' اور دوڑ کے اُس سے لپٹ گیا۔)

زمُرد: (حسین کو علیحدہ کر کے) ذرا صبر سے کام لو پہلے مجھے شہزادی کے سامنے اپنی احسان مندی ظاہر کرنے دو۔

بلغان خاتون: تو تم ہی زمّرد ہو۔ (یہ کہہ کہ اُس نے زمّرد کو گلے سے لگالیا اور بولی) ’’بہن، میرا کیا احسان ہے۔ہاں، تمھاری البتّہ انتہا سے زیادہ شکر گزار رہوں۔اگر تم مدد نہ کرتیں تو مجھے غم والم سے نجات نہ ملتی۔

زمّرد: (مسکرا کے کسی قدر ندامت سے) مگر شہزادی، اِس میں میری خودغرضی بھی تو تھی۔

بلغان خاتون: اسے خودغرضی نہ کہنا چاہیے۔ یہ اس سادہ لوح نوجوان پر تمھارا احسان ہے کہ اپنی محبت سے اِسے عزت بخشی اور اتنے بڑے اور اس قدر گہرے فریب سے نجات دلائی۔اس کے بعد زمّرد حسین کی طرف متوجّہ ہوئی اور پوچھا ’’اب تو تم پر سارا راز کُھل گیا؟‘‘

حسین: راز کیسا؟ میں نے شہزادی کے حکم کی اطاعت کی اور صرف اس وجہ سے کہ تمھاری ہدایت تھی۔

بلغان خاتون: نہیں۔ابھی میں نے ان سے کچھ نہیں کہا اور نہ تمھارا کوئی خط دکھایا ہے۔مگر جب سے یہ باغ میں داخل ہوئے ہیں انتہا سے زیادہ پریشان ہیں اور بدحواس ہیں۔اب اپنے ساتھ لے جاؤ اور جو کچھ کہنا ہو کہہ دو تا کہ ان کی وحشت ذرا دور ہو اور آدمی بنیں۔

زمّرد: افسوس! غلطی میں یہ ایسے ایسے کام کر چکے ہیں کہ اطمینان تو انھیں بڑی مشکلوں سے نصیب ہوگا۔

بلغان خاتون: لیکن اب یہی مصلحت ہے کہ انھیں اپنے قصر میں لے جاؤ اور کوشش کرو کہ ان کی آنکھیں کے سامنے سے فریب کا پردہ اُٹھ جائے۔مگر ہاں، پہلے مجھے یہ بتا دو کہ یہاں کسی کا خوف تو نہیں؟ تمھارے لکھنے کے مطابق میں آنے کو تو چلی آئی مگر اندیشہ ہے

کہ کوئی خرابی نہ اُٹھ کھڑی ہو۔

زمّرد: شہزادی! آپ مطمئن رہیے۔کسی بات کا اندیشہ نہیں۔آج شام تک آپ یہاں بے کھٹکے رہ سکتی ہیں۔مگر وہ جو میں نے لکھا تھا، اس کا بھی بندوبست آپ نے کرلیا ہے؟

بلغان خاتون: سب سامان کر چکی ہوں۔اگرچہ اس کے متعلق مجھے ذرا سا تردّد ہے۔

زمّرد: وہ کیا؟

شہزادی: خیر، کوئی مضائقہ نہیں۔اِس کو پھر بیان کروں گی۔

یہ کہہ کہ اُس نے باقی ماندہ جوان کو بھی جو ساتھ آیا تھا کچھ کان میں کہہ کہ واپس بھیجا اور زمّرد سے پوچھنے لگی ''یہ بتاؤ، قلعے پر کدھر سے حملہ ہوسکتا ہے؟''

زمّرد: آپ قلعے میں ہیں۔مگر اتنا حصّہ قلعے سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔اگر چہ غیر لوگ نہر ویرنجان کے ذریعے سے اور بیرونی دیوار کے نیچے سے نکال کے لائے جاتے ہیں مگر اسی نہر کے اس طرف خورشاہ کا محل ہے۔

حُسین: (چونک کر) خورشاہ کا محل! وہ یہاں کہاں؟ وہ تو اَلموت میں ہے۔

بلغان خاتون: (ہنس کے) اب انھیں ان کے قصروں میں وہیں پہنچا دو جس کے دیکھنے کا انھیں شوق ہوگا۔ باقی باتیں پھر آکے کرنا۔یہ اگر یہاں موجود رہے تو بات نہ کرنے دیں گے۔

زمّرد: بے شک شہزادی۔آپ بجا فرماتی ہیں۔انھیں وہاں بٹھا کے ابھی آتی ہوں۔

یہ کہہ کے اُس نے حسین کا ہاتھ ہاتھ میں لیا، جو ایک خودفراموشی کے عالم میں کھڑا تھا اور شہزادی کو تنہا چھوڑ کے اُسے کھینچتے ہوئے اپنے قصر دری میں لے گئی۔حسین راستے بھر اس سے طرح طرح کے سوالات کرتا رہا مگر زمّرد نے ہر سوال کے جواب میں یہی کہا کہ پھر بتاؤں گی اور اُسے قصر میں بٹھا کے شہزادی کے سامنے واپس آئی۔

بلغان خاتون: ہاں تو، خورشاہ کے محل کو یہاں سے راستہ گیا ہے؟

زمّرد: جی ہاں۔ وہ روز یہاں آ کے عیش و عشرت میں مشغول ہوا کرتا ہے۔ آپ اِس راستے سے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ بہ آسانی پہنچ جائیں گی۔ پہلے نہر کا پُل ہے۔ اُس سے اُترتے ہی آپ کو ایک راستہ ملے گا جو سیدھا خورشاہ کے حرم سرا کو گیا ہے جس میں داخل ہوتے ہی آپ سمجھ لیجیے کہ المُوت کے قلعے میں پہنچ گئیں۔ اور آج عید کا دن ہے اور معمول ہے کہ اِس زمانے میں کوئی شخص نہ جنت میں لایا جاتا اور نہ خورشاہ آ سکتا ہے۔ اس لیے کہ اِس علاقے کے تمام معزّز اور مُقرب لوگ نیز دُور دُور کے برسرآوردہ نقیب امام کی زیارت کو آتے ہیں، اور قلعے میں عام مُعتقدین کا بڑا بھاری مجمع رہتا ہے۔ اسی خیال سے میں نے آپ کو رمضان کی ۲۷ تاریخ کو بُلایا ہے، کیونکہ اس دن لازمی طور پر یہ باغ غیروں سے خالی رہتا ہے اور خود خورشاہ کو بھی تین چار دن تک یہاں آنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اگر اور کوئی زمانہ ہوتا تو اب تک آپ کے آنے کا حال قلعے میں معلوم ہو گیا ہوتا۔

بلغان خاتون: تو ابھی تک کسی کو ہمارے آنے کی خبر نہیں؟

زمّرد: بالکل نہیں۔ اوّل تو یہاں کوئی مرد نہیں جو لوگوں کو خبر کر کے لڑائی کا سامان کرے اور شاید کوئی عورت بھاگ کے چلی بھی جاتی مگر میں نے آج صبح سے شہر کے پُل کے پھاٹک میں قُفل لگا دیا ہے اور کُنجی میرے پاس ہے۔ لہٰذا ممکن نہیں کہ کوئی بھی بھاگ کے قلعے میں جا سکا ہو اور لُطف یہ کہ ان دنوں ادھر سے بھی کوئی آنے والا نہیں۔

بلغان خاتون: یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔ تم کہتی ہو آج عید ہے، جب کہ قلعے میں خوشی کا جوش و خروش ہو گا۔ پس کوئی فکر نہیں۔ آج شام سے پہلے ہی ہمارا حملہ ہو جائے گا۔ مگر زمّرد مجھے ایک بات

کا تردّد ہے۔ جس فوج کو میں نے اپنی مدد کے لیے بُلایا تھا، اُس کا ابھی تک پتا نہیں۔ میرے ہمراہ صرف پانچ سو سپاہی ہیں جو شاید کافی نہ ہوسکیں۔

زمّرد: میں تو سمجھتی ہوں کہ پانچ سو جوان بھی قلعے پر ادھر سے جا کر قبضہ کر لیں گے۔

بلغان خاتون: مگر مجھے یقین ہے کہ ہماری کمک آئے گی ضرور۔ صرف شام تک کی مُہلت چاہیے۔

زمّرد: شام کیا معنی، آپ کل تک یہاں مخفی رہ سکتی ہیں۔ کوئی اندیشے کا مقام نہیں۔ پس جب تک کمک آئے، یہاں آرام فرمائیے۔ آپ تھک بھی گئی ہوں گی۔ ستانے کے لیے اچھی مُہلت مل گئی۔ اس کے بعد شہزادی نے پوچھا ''اور زمّرد، یہ لباس جو تم نے میرے دونوں ساتھیوں کے لیے تجویز کیا ہے، اِسمیں کیا مصلحت تھی؟''

زمّرد: آپ کا لباس تو وہی حُوروں کا لباس ہے جس کو لوگ یہاں حلّہ جنت سمجھتے ہیں۔ اس لباس کی وجہ سے کسی پر بدگمانی نہیں ہوسکتی۔

بلغان خاتون: شاید اسی لیے مجھے وہ کپڑے پہنے دیکھ کے حسین نے کہا تھا کہ آپ حور معلوم ہوتی ہیں۔

یہ جُملہ سُن کے زمّرد بھی ہنسی اور بولی ''مگر اپنے لباس کے متعلق انھوں نے کچھ نہ کہا؟

بلغان خاتون: اور ہاں، مردوں کے لیے ایسا بے ہودہ لباس تم نے کیوں تجویز کیا؟

زمّرد: اس لیے کہ مردوں میں یہاں عام طور پر دہی دودھ والے آیا کرتے ہیں جو یہاں کی نہروں اور حوضوں میں دودھ اور شراب بھرتے ہیں۔ اگر کوئی مرد اس لباس کو پہنے ہوئے یہاں آئے تو کسی کو بھی خیال نہ ہوگا کہ کوئی غیر ہے۔

بلغان خاتون: مگر ایسا نہ ہو کہ کسی کو خبر ہو جائے اور قبل از وقت راز کھل جائے۔

زمّرد: کسی کو خبر نہ ہوگی۔ آپ شوق سے یہاں فروکش ہوں۔ عید کے دن کسی کو یہاں آنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔

بلغان خاتون: بہتر، میں یہیں ٹھہروں گی۔ مگر مجھے چل کے ذرا جنت کی سیر کرا دو اور پُل سڑک بھی دکھا دو تا کہ راستہ خوب پہچان لوں۔

زمّرد: چلیے۔

اِس تجویز کے بعد دونوں حسین و نازنین عورتیں قصروں اور کوشکوں کی سیر کرتی اور باغوں اور چمنوں کی بہار دیکھتی ہوئی اس بڑی نہر کے کنارے پر پہنچیں جس کے راستے سے لوگ سونے کی کشتی میں بٹھا کے جنت کے اندر لائے جاتے تھے۔ اس نہر کے پُل کے پھاٹک میں قفل لگا ہوا تھا جسے زمّرد نے کھولا اور دونوں لڑکیاں دوسری وادی کے میدان میں اُتریں۔ اُدھر بھی ایک پھولوں کا مُسطّح تختہ دُور تک بنا ہوا تھا اور درمیان میں سے ایک سڑک گزرتی تھی جو تھوڑی دُور تک کھلی فضا میں جا کے بڑے سایہ دار درختوں کے ایک جُھنڈ میں غائب ہو گئی تھی۔ اِنھی درختوں کے اُس طرف حرم سرا کا راستہ تھا۔ یہ دلچسپ سیر کر کے شہزادی واپس آئی اور زمّرد کے انتخاب کے مطابق عالی شان فیروزہ کے کوشک میں جا کے فروکش ہو گئی۔ زمّرد دیر تک اُس کے پاس بیٹھی رہی اور جب دیکھا کہ شہزادی لیٹ کے آرام کیا چاہتی ہے تو اُس سے رُخصت ہو کے دروازہ اندر سے بند کروا دیا اور اپنے قصر کی طرف روانہ ہوئی۔

آٹھواں باب

افشائے راز

حیرت زدہ حواس باختہ نوجوان حسین کو زمّرد شہزادی کی تجویز کے مطابق قصر دری میں چھوڑ کے واپس گئی تو وہ گھبرا کے ایک ایک کو دیکھتا اور اپنے دل سے پوچھتا تھا کہ کیا حقیقت میں یہ وہی مقام ہے جہاں وہ امامِ قائم قیامت کی وجہ سے آیا تھا۔ مگر وہ تو ملاءِ اعلیٰ پر تھا اور یہ زمین ہی پر ہے۔ لیکن کیوں کر شک کیا جائے۔ خود زمّرد بھی تو موجود ہے۔ اگر یہ کوئی دنیاوی باغ ہے تو وہ کیوں کر چلی آئی؟ خود اسی نے لکھا تھا کہ جنت میں ہوں اور فردوسِ بریں کی سیر کر رہی ہوں۔ آخر اسے جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ؟

اس کے بعد وہ محل کے برآمدے میں جا کھڑا ہوا اور ہر ایک عمارت، ایک ایک چمن کو غور سے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگا۔ ہر چیز وہی اور ویسی ہی تھی۔ جیسی کہ پہلے نظر سے گزری تھی۔ قصروں کی روکار پر اسی طرح جوہرات جڑے ہوئے تھے۔ ان کی وضع بھی ویسی ہی تھی۔ چمنوں کا بھی وہی رنگ اور وہی نقشہ تھا۔ سڑکیں اور روشیں بھی اسی طرح رنگ برنگ اور نظر فریب تھیں۔ سونے چاندی کے تخت و تاج بھی اُسی پہلی شان سے تھے۔ نہریں بھی اُسی مستانہ روی سے بہ رہی تھیں۔ ہاں صرف ایک چیز کی کمی تھی، اور وہ وجد میں لانے والا گانا تھا۔ مگر جب اس نے طیور کی زبان سے وہی ترانۂ خیر مقدم سُن لیا تو ادھر سے بھی شک جاتا رہا۔ وہ اسی پس و پیش میں تھا کہ ایک طائر نے ایک تازہ اور شاداب سیب چونچ میں لا کے سامنے ڈال دیا۔ ''یہ بھی خاص فردوسِ بریں کی علامت ہے۔''

حسین کے خیالات میں ایک عجیب قسم کا تردّد و اضطراب تھا۔ یہ مُعمّا کسی طرح حل ہونے میں نہ پایا

تھا کہ سامنے سے زمّرد نظر آئی جو شہزادی سے رخصت ہو کے اُس کے پاس آ رہی تھی۔ اس کی دل رُبا اور ناز آفریں صورت دیکھتے ہی وفورِ جوش سے حسین کا دل دھڑ کنے لگا اور عشق کے جذبات نے یک بیک ایسی بے اختیار حالت طاری کی کہ برآمدے سے اُتر کے استقبال کو دوڑا اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

حسین: پیاری زمّرد! للہ بتاؤ کہ میں کس عالم میں ہوں اور یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟

زمّرد: (مسکرا کے) وہی دیکھ رہے ہو جو ایک دفعہ دیکھ چکے ہو۔

حسین: یعنی وہی ملاءِ اعلیٰ پر ہوں؟

زمّرد: واقعی جو ساز و سامان نظر آ رہا ہے اِس لحاظ اس جگہ کو ملاءِ اعلیٰ ہی کہنا چاہیے۔

حسین: کہنا چاہیے؟ تو کیا اصل میں نہیں؟

زمّرد: تم اپنے دل سے پوچھو۔ تم نے اس مقام کو زمین پر پایا یا آسمان پر؟

حسین: آیا تو زمین ہی کے راستے ہوں۔

زمّرد: تو زمین ہی پر سمجھیں۔

حسین: مگر کیوں کر سمجھوں؟ تمھاری قبر پر تمھارے وہ خطوط یہاں تک آنے کے ذریعے ہیں۔ ان تمام باتوں میں جس چیز کا خیال کرتا ہوں، اِس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ کوئی اور عالم ہے اور یہاں کی مسّرتیں دنیاوی مسّرتوں سے بالا ہیں۔

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں قصر میں داخل ہوئے اور زمّرد نے کہا ''یہاں کی مسّرتیں تو بے شک دنیا کی مسّرتوں سے بالا ہیں مگر یہ نہ سمجھو کہ تم دنیا سے نکل کے کسی اور جگہ آ گئے ہو۔

حسین: پھر وہ سب واقعات جو گزر چکے ہیں، ان کی نسبت کیا خیال کروں؟

زمّرد: یہ سب میری مجبوری، میری بے دست و پائی اور تمھاری سادہ لوحی کا نتیجہ ہے۔

حُسین: میں اس کا مطلب نہیں سمجھا؟

زمّرد: گھبراؤ نہیں۔ سب سمجھ جاؤ گے۔ مگر افسوس! جس قدر سمجھو گے، اُسی قدر زیادہ پریشان ہو گے اور اپنے کیے پر پچھتاؤ گے۔

حُسین: زمّرد! اب مجھے تیری صُورت پر بھی شُبہ معلوم ہوتا ہے۔ تو وہی زمّرد ہے جو میرے ساتھ آمل سے آئی تھی؟

حسین کی زبان سے سادگی کا سوال سُن کے زمّرد کو ہنسی آئی مگر ضبط کیا اور ایک عجیب دل فریب ادا کے ساتھ پُر معنی اور شوخ چتونوں سے دیکھ کے بولی "نہیں۔ دوسری ہوں۔" اس جواب کو حسین نے سُنا ہی نہیں تھا۔ اس نے زمّرد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور غور سے دیکھ کے بُولا "وہی نورانی جسم ہے یا میرے ہی جسم کا سا مادّی پُتلا؟"

زمّرد: ہوش کی باتیں کرو۔ تم بالکل از خود رفتہ ہوئے جاتے ہو۔ تمھاری آنکھوں کے سامنے سے ایک بہت بڑا طلسم ٹوٹا ہے جس کے اثر سے تمھارے حواس ٹھکانے نہیں رہے۔ ذرا ہوش میں آؤ اور حواس کی باتیں کرو کہ سارا راز، تمام سرگزشت بیان کروں۔

حُسین: پیاری زمّرد، جلدی بیان کرو۔ اس لاعلمی اور ناواقفی نے مجھے دیوانہ کر رکھا ہے۔

زمّرد: اُس وادی میں ہم دونوں نے جن پریوں کو دیکھا تھا، وہ پریاں نہ تھیں بلکہ اِسی مصنوعی جنت کی حوریں تھیں۔

حُسین: (حیرت سے بات کاٹ کے) مصنوعی جنت! یہ وہ جنت نہیں جس کا وعدہ مومنین سے کیا گیا تھا؟

زمّرد: ذرا صبر کرو۔ خیر، تم وہاں بے ہوش ہو گئے اور مجھے وہ یہاں پکڑ لائیں۔ نہ میں ماری گئی نہ شہید ہوئی۔ مگر اس لیے کہ تم کو میرے مرنے کا یقین آ جائے، انھوں نے واپسی سے پہلے بھائی کی قبر میں ذرا تغیّر پیدا کیا اور اُسی وقت رات کو مجھ سے پوچھ کے بھائی کے نام کے برابر میرا نام بھی کندہ کر دیا۔ اس سے غرض صرف یہ تھی کہ تم مجھ سے مایوس اور میرے خیالوں سے دست بردار ہو کر چلے جاؤ۔ اس وادی کی خطرناک حالت ہر ملنے والے سے بیان کرو اور یہاں کی پریوں کی اہمیت ہر شخص کے دل میں بٹھا دو۔

حسین: تم تو زندہ ہو (یہ کہا اور زمّرد کو سر سے پاؤں تک گھور کے دیکھنے لگا۔)

زمّرد: (جھنجھلا کے) نہیں چڑیل ہو گئی ہوں (حسین نے کچھ اِس کا جواب نہیں دیا اور زمّرد نے ایک لمحہ توقف کر کے پھر سلسلۂ کلام شروع کیا) تو تم کو یہ دھوکہ دیا گیا اور میں یہاں لانے کے بعد انھی عورتوں میں شامل کر دی گئی جو یہاں حُوریں کہلاتی ہیں۔ چند روز بعد دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ تم اُسی طرح میری قبر کے مُجاور بنے بیٹھے ہو اور جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ آخر یہاں غور کیا گیا کہ وہ وادی تم سے کیوں کر خالی ہو۔ اکثروں کی رائے تھی کہ قتل کر ڈالنا چاہیے۔ مگر اتفاق سے میری تدبیر کارگر ہوئی اور تجویز قرار پائی کہ کسی ایسے طریقے سے تمھیں وطن جانے کی ہدایت کی جائے کہ کسی کا لگاؤ ثابت نہ ہو اور تم بغیر اُس کے کہ کسی قسم کی بدگمانی کرو، وہ وادی چھوڑ دو۔ اس تجویز کا نتیجہ میرا پہلا خط تھا جس میں تم سے میری وصیت پوری کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ وہ خط میرے ہی ہاتھ سے لکھوایا گیا اور مجھ سے حالات دریافت کر کے اُس کے مضمون کا مسوّدہ تیار کیا گیا۔ مگر حسین! وہ خط صاف کرتے وقت میں چپکے چپکے بہت روتی تھی۔ اِس لیے کہ جانتی تھی

کہ خود اپنے ہاتھ سے دائمی مُفارقت کا سامان کر رہی ہوں۔ خیر، وہ خط تمھارے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ اب بھی تم اُسی طرح بیٹھے ہو اور گویا تمھارے ارادے میں تبدیلی نہیں ہوئی۔

حُسین: بے شک نہیں ہوئی تھی۔ زمّرد، میں تو مر جاتا اور وہاں سے نہ ہٹتا۔

زمّرد: جب یہ معلوم ہوا تو اُن لوگوں کو پھر فکر پیدا ہوئی۔ کئی مرتبہ خود مجھ سے کہا گیا کہ یہ تدبیر بے سُود ہوئی۔ اب کیا کیا جائے؟ اب کوئی تدبیر میرے ذہن میں نہ آتی تھی اور دل میں ڈر رہی تھی کہ کہیں یہ غضب نہ ہو کہ یہ لوگ تمھارے مار ڈالنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اتفاقاً انھی دنوں میں خبر آئی کہ امام نجم الدین نیشاپوری باطنین کے خلاف وعظ کہہ رہے ہیں اور تدبیریں کی جا رہی تھیں کہ کس فدائی کے ہاتھ سے وہ قتل کرا دیے جائیں۔ کم بختی یا شامتِ اعمال سے میری زبان سے نکل گیا کہ وہ تمھارے چچا اور تمھارے اُستاد و مرشد ہیں۔ یہ خبر جیسے ہی یہاں کے بادشاہ خورشاہ کو پہنچی اُس نے خیال کیا کہ وہ امامِ عالی مقام تمھارے ہاتھ سے قتل ہوں تو زیادہ مناسب ہے۔ اِس طرح زمانے بھر کو معلوم ہو جائے گا کہ مذہبِ باطنیہ دلوں پر کس قدر گہرا اثر ڈالتا ہے کہ انسان اپنے عزیز و اقارب، اُستاد و مُرشد تک کی پروا نہیں کرتا۔ تمھارے خنجر سے اُن کا قتل ہونا ایک ساتھ ان باتوں کا ثبوت دے سکتا ہے کہ بھتیجے نے چچا کو، شاگرد نے اُستاد کو مرید نے مرشد کو بلا تامّل ثواب سمجھ کے قتل کر ڈالا۔

زمّرد نے یہاں تک کہا تھا کہ حسین نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لی اور آبدیدہ ہو کے کہنے لگا" افسوس! میں نے شفیق بزرگ اور خدا شناس مُرشد کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ زمّرد! یہ تیرے ہی شوق میں اور تیری ہی ہدایت کی وجہ سے تھا ورنہ میں اتنے بڑے ظلم کی ہرگز جرأت نہ کرتا۔

زمّرد: حسین! میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتی ہوں کہ اس گناہ میں مجھے شریک نہ

کرو۔ مجھے جب اس کا خیال آ جاتا ہے تو کانپ اُٹھتی ہوں۔ مگر اس ذکر کو جانے ہی دو۔ ایک ہونے والی بات تھی جسے کوئی نہ روک سکتا تھا۔ میں نے اگر تمھیں اس کام کے لیے تیار کیا تو میں اپنے بس میں نہ تھی اور تم اگر آمادہ ہو گئے تو تم اپنے ہوش میں نہ تھے۔

حسین: (زور سے سینہ پیٹ کے) مگر افسوس زمّرد! یہ عُذر خدا کے سامنے نہ کیے جائیں گے مَیں نہ ہوش میں تھا نہ بے ہوش۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ایک گناہِ عظیم کر رہا ہوں مگر تیرا شوق بار بار دل کو اُٹھا کے آمادہ کرتا تھا۔

زمّرد: (بے تابی سے بات کاٹ کر) پھر میرا نام! خدا کے لیے حسین مجھے اپنے ساتھ نہ لے جاؤ۔ (آنسو بہا کے) میں نے کچھ کیا ہے، مجبوری اور بے بسی میں۔ افسوس! خود اپنے دل سے تو لعنت کی آواز سُن رہی ہوں، تمھاری زبان سے بھی وہی سنتی ہوں۔

یہ کہہ زمّرد زار و قطار رونے لگی۔ حسین نے بے اختیاری کے ساتھ جلدی سے اُس کے آنسو پونچھے اور کہا:

''زمّرد! بے شک تُو بے خطا ہے۔ اگر میں نے تیرا دل دکھایا تو معاف کر اور آگے بتا کہ پھر کیا ہوا؟''

زمّرد: (رومال سے آنسو پونچھ کر) پھر تم کو دوسرا خط ملا جس میں تمھیں کوہِ جودی کے غار اور شہرِ خلیل کے تہ خانے میں چلّہ کشی کرنے اور پھر حلب جا کر شیخ علی وجودی سے ملنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ وہ خط بھی اسی طرح بھیجا گیا کہ اس کا مسوّدہ لکھ کے مجھے دیا گیا اور جب میں نے اپنے ہاتھ سے صاف کر دیا تو میری قبر پر رکھوا دیا گیا۔

حسین: لیکن اگر اتنا ہی کام تھا کہ امام نجم الدین نیشاپوری قتل کر ڈالے جائیں تو مجھے اتنے چکر

کیوں دیے گئے اور میرے راستے میں بے کار کی دشواریاں کیوں پیدا کی گئیں؟

زمّرد: اس لیے کہ تمھارے شوق میں ہیجان اور بے صبری پیدا ہو۔ اگر بغیر اتنے چلّے کھنچوائے اور بغیر علی وجودی کے پاس ایک سال تک انتظار کرانے کے کہہ دیا جاتا تو تم اتنے بڑے گناہ کے ارتکاب پر ہرگز آمادہ نہ ہوتے۔

حسین: زمّرد! تیرا شوق میرے دل میں اس قدر تھا کہ جس کام کو کہا جاتا، اُسی وقت پورا کرنے کو تیار ہو جاتا۔

زمّرد: خیر، تو اُن کو نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بے وقوف ہو اور تمھارے اخلاق اِس قدر کمزور ہیں۔

حسین: مگر کیوں کر کہوں زمّرد! مجھے تیری باتوں کا یقین نہیں آتا۔ اِن آنکھوں سے ایسی ایسی کرامتیں اور عقلِ انسانی سے اس قدر بالا باتیں دیکھ چکا ہوں کہ ان لوگوں کی خدا شناسی سے انکار کرنے کی کسی طرح جرأت نہیں ہوتی۔ جن گدھوں پر ہم دونوں سوار ہو کے یہاں آئے تھے وہ تو مر چکے تھے مگر مجھے ایک نیا تازہ دم گدھا اُسی درخت سے بندھا ملا اور ایسا خوبصورت توانا و تندرست اور تیز رو کہ اس وقت تک میں یہی سمجھتا تھا کہ میری سواری کے لیے خاص خدا کے پاس سے آیا تھا۔

زمّرد: وہ گدھا یہیں سے بھیجا گیا تھا۔ جس وقت تمھارے نام کا خط قبر پر رکھوایا گیا تھا، اُسی وقت وہ گدھا ایک دوسرے راستے سے بھیج کر اُس درخت سے بندھوایا گیا تھا۔

حسین نے اس جواب کو حیرت سے سُنا اور بولا ''عجب! مگر پھر بھی میرے شبہات دور نہیں ہوتے۔ آخر شیخ وجودی کو میرے سب حالات کیوں کر معلوم ہو گئے؟ وہ یہاں سے دس ہزار کوس کے فاصلے

پر ہیں۔''

زمّرد: تمھارے روانہ ہونے کے ساتھ ہی اُن کو تمام واقعات کی خبر دی گئی۔ اُن کو لکھ بھیجا گیا تھا کہ امام نجم الدین کے بھتیجے، شاگرد اور مُرید سے اُن کے قتل کا کام لینا ہے اور وہاں پہنچنے سے پہلے تم کوہِ جودی کے غار اور خلیل کے تہ خانے میں چلّہ کھینچو گے۔ یہ سب باتیں ان کو دوسرے ذریعے سے معلوم ہو چکی تھیں مگر انھوں نے غیب دانی اور کرامت کی شان سے بیان کر کے تمھیں اپنا فریفتہ بنا لیا۔

حسین نہایت ہی مُتعجب تھا۔ وہ حیرت کے دریا میں غرق تھا اور کسی طرح رہائی نہ ملتی تھی۔ زمّرد اپنی بات پوری کر کے خاموش ہو گئی اور وہ سوچ میں پڑا تھا کہ آخر اس نے سخت حیرت زدگی کی شان سے آنکھیں اُٹھا کے دیکھا اور کہا کہ یہ سب باتیں تُو سچ کہہ رہی ہے یا مجھے دھوکا دے رہی ہے؟ مجھے تو اپنی گزشتہ زندگی ایک خواب سی معلوم ہوتی ہے۔ مُتردّد ہوں کہ اس ملاقات اور ان سب باتوں کو خواب سمجھوں یا اُن تمام واقعات کو جو تجھ سے جُدا ہونے کے بعد پیش آئے؟ کیا حقیقت میں مَیں اتنا بڑا بے وقوف ہوں کہ ایسے عظیم الشان فریب اور جہل میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن زمّرد اگر یہ سب سکھائی باتیں تھیں تو علی وجودی کو اُسی قدر حال معلوم ہوتا جس قدر یہاں بتایا گیا تھا۔ یہ کیوں کر معلوم ہو گیا کہ میں شہرِ خلیل کے مجاوروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔

زمّرد: حسین! تم حقیقت میں بڑے سادہ لوح ہو۔ اس کا سبب میں بغیر جانے سمجھ گئی اور تم نہیں سمجھ سکے۔ لیکن درحقیقت تم مجبور ہو۔ تمھارے دل و دماغ پر ہر طرف سے اتنا اثر ڈالا گیا کہ بمشکل ان باتوں کو اپنے دماغ سے نکال سکتے ہو۔ تم کو نہیں معلوم کہ باطنیین دنیا کے ہر کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان سازشوں کا جال ہر گاؤں اور چھوٹے قصبے تک پڑا ہوا ہے۔ علی وجودی کے

ساتھ تم پورے ایک سال رہے۔ ممکن نہیں کہ اُس کا حال تمھیں نہ معلوم ہو گیا ہو۔

حسین: ہاں، میں نے البتہ یہ دیکھا کہ ان کے معتقد تمام اطرافِ عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہر سال ایک دفعہ اُن کی زیارت کو بھی آتے ہیں۔ اور مجھے یہ بھی نظر آیا کہ وہ لوگ پوشیدہ طور پر اور صرف رات کو مل کے چلے جاتے ہیں۔

زمرد: اِسی سے سمجھ سکتے ہو کہ اُن کے کان میں خبریں پہنچنے کے کتنے بڑے ذریعے موجود ہیں۔ تم نے جس وقت اس وادی کو چھوڑا تھا آخر وُ و دِحاب تک ہر منزل اور ہر مقام پر تمھاری نگرانی ہوتی ہوگی اور تمھاری روز روز کی خبر علی وجودی کو پہنچتی ہوگی۔ کچھ تم ہی پر منحصر نہیں، اِن باطنیین کے پنجے میں جو شخص پڑتا ہے، اِسی طرح نظروں میں رکھا جاتا ہے۔ پھر کیوں تعجب کی بات تھی اگر تمھاری شہرِ خلیل کی گرفتاری کا حال اُن کو معلوم ہو گیا۔

حسین: مجھے اس پر حیرت نہیں۔ حیرت کی تو یہ بات ہے کہ شیخ کہتے تھے انھی کے اشارے سے باطنیین نے حملہ کر کے مجھے قید سے آزاد کرایا۔

زمرد: کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بے شک اِسی وجودی نے تمھارے چھڑانے کے لیے اپنے معتقدوں کو حملہ کرنے کا حکم دیا ہوگا۔

حسین: مگر کیونکر حکم دے گا؟ میری گرفتاری کی خبر پہنچنے اور وہاں سے حملے کا حکم آنے میں بھی آخر زمانہ لگتا۔ وہاں تو یہ واقعہ پیش آیا کہ جس رات میں نکلنے والا تھا، میرے باہر آنے سے پیشتر ہی خلیل کا حاکم باطنیین کے ہاتھ سے قتل ہوا اور پھر میں گرفتار ہوا تو اس کو پورا ایک دن نہیں گزرنے پایا تھا کہ اُن کا ایک بڑا گروہ شہر میں آ پڑا۔ ان تمام باتوں کی تکمیل اتنی جلدی کیوں کر ہو سکتی ہے؟

زمّرد: (ذرا تامّل کر کے) یہ کون مشکل ہے۔ باطنیین کو معلوم ہو گا کہ تم کس روز تہ خانے سے اُترے تھے اور کس روز نکلو گے۔ اس زمانے میں انھوں نے شیخ علی وجودی کو خبر کر کے مدد کرنے کا اشارہ پالیا ہو گا۔ اُسی کے مطابق دن گنتے رہے اور ٹھیک چالیسویں دن جس دن تم نکلنے والے تھے، انھوں نے رئیسِ شہر کو قتل کر ڈالا کہ لوگ دوسری فکر میں رہیں اور تم چپکے سے نکل کے بھاگ جاؤ۔ مگر جب انھیں خبر پہنچی کہ اُس رئیس کے قتل سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا اور تم مجاوروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے تو انھوں نے حملہ کر کے شہر میں کھلبلی ڈال دی اور تمھیں چھوٹ کے بھاگ جانے کا موقع مل گیا۔

حسین: (زور سے سرد آہ بھر کے) تو زمّرد، افسوس! یہ سب جھوٹ تھا۔ شیخ علی وجودی کا سا شخص اور اتنا بڑا مکّار! کیوں کر کہوں، زمّرد! ان کرامتوں اور غیب دانی کے علاوہ ان کا علم و فضل اس پائے کا ہے اور ان کے ہر ہر لفظ سے ایسی خدا شناسی اور آشنائے رموزِ وحدت ہونے کی بو آتی ہے کہ چاہتا بھی ہوں تو اُن پر بدگمانی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اتنا بڑا عالم و فاضل، ایسا نکتہ سنج و دقیقہ رس اور اتنا بڑا افریبی! میں امام نجم الدین کی صحبت میں رہ چکا ہوں۔ مگر پیاری زمّرد! سچ کہتا ہوں کہ جو بات مجھے شیخ علی وجودی میں نظر آئی اور جس آسانی سے وہ دل کے شکوک رفع کرتے ہیں، امام نجم الدین میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ تھا۔

زمّرد: بے شک ایسا ہی ہو گا۔ مگر بات یہ تھی کہ امام نجم الدین جو دل میں آتا ہو گا، سادگی اور بے تکلفی سے کہہ گزرتے ہوں گے۔ انھوں نے اُسے بنانے اور اپنا اثر ڈالنے کی کبھی کوشش نہ کی ہو گی، اور شیخ علی وجودی کا ہر لفظ بنا ہوا اور دل پر اثر ڈالنے کے لیے ہوتا ہو۔ اس کے ہر فقرے میں پوری ریا کاری ہوتی ہے۔ جھوٹ اور سچ میں بھی فرق ہے۔ کیا فریبی کی باتیں ایک راست باز

اور سادہ مزاج شخص کی باتوں سے زیادہ دلچسپ اور زیادہ دل نشین نہیں ہوا کرتی ہیں؟ یقین ہے کہ شیخ علی وجودی سے مل کے تم کو خدا شناسی کا بہت عمدہ سبق مل گیا ہوگا۔

حُسین: (زور سے سینے پر ہاتھ مار کے) ہاں! خوب سبق ملا۔ مگر حقیقت اُس وقت معلوم ہوئی جبکہ پورا جادو اثر کر چکا اور میں ساری دنیا سے زیادہ ظالم، سیہ کار، بے دین اور بے وقوف بن چکا۔ افسوس! اب تمام عمر پچھتاؤں گا۔ مگر زمّرد کیا کہوں، اب بھی یہ سب باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔ طورِ معنی اور اس کے نورانی قصر کی صورت اس وقت تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔

زمّرد: ہاں! وہ بھی اِس مذہب کا بڑا رکن ہے۔ اِس وقت صرف دو ہی شخص شاہ المُوت کو ملے ہیں جن سے اچھا نقیب و داعی اس مذہبِ باطنیہ کو نہیں نصیب ہو سکا۔ طورِ معنی اور علی وجودی جو یہاں وادیِ ایمن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان دونوں نے اپنی گہری سازشوں سے صدہا اُمرا و زرا اور عُلما فضلا قتل کر ڈالے۔ اور چوں کہ اس جنت و ملاءِ اعلیٰ کی اصلیت کو اچھی طرح جانتے ہیں، لہٰذا ان پر سارا فریب کھلا ہوا ہے اور لوگوں کو جان بوجھ کر گمراہ کرتے ہیں۔ طورِ معنی بھی لوگوں سے ملتا ہے۔ مگر وادیِ ایمن نے دنیا کو بہت خراب کیا۔ دین کو جتنا ضرر اس شخص کے ہاتھ سے پہنچا ہے شاید کبھی کسی کے ہاتھ سے پہنچا ہوگا۔

حسین: تو کیا طورِ معنی کے زمین دوز قصر میں بھی کوئی قدرتی کرشمہ نہیں؟ اس جنت کی طرح وہ بھی لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے بنایا گیا ہے؟

زمّرد: (مسکرا کے) کیا تمھیں ابھی شک ہے؟

حسین: شک نہیں پیاری زمّرد! تیری باتوں کا یقین ہے۔ مگر کیا بتاؤں کہ ان آنکھوں کے

سامنے سے کیسی کیسی کیفیتیں گزر چکی ہیں اور ان کانوں سے کیسے کیسے روشن اور دلفریب الفاظ سُنے ہیں۔ خیر یہ بھی نہ سہی، مگر طورِ معنی کا قصر تو اِصفہان میں ہے۔ وہاں کے غار سے یہاں کیونکر پہنچ گیا؟

زمّرد: الُموت کا نام چونکہ کسی قدر مشہور ہو گیا ہے اور بعض لوگ بھڑک گئے ہیں لہٰذا جن لوگوں کی نسبت ایسا خیال ہوتا ہے، وہ اِصفہان اور طورِ معنیٰ ہی کے ذریعے سے یہاں بھیجے جاتے ہیں۔ اور سارا راز مخفی رکھنے کے لیے یہ تدابیر عمل میں لائی جاتی ہے کہ طورِ معنیٰ انھیں بے ہوش کر کے اونٹوں کی قطار پر سوار کراتا ہے اور وہ راز دار اور مُعتبر ساربانوں کے ذریعے سے الُموت تک پہنچا دیے جاتے ہیں۔ ہر منزل پر رات کو کسی جگہ ان لوگوں کو ہوش میں لا کے کچھ کھلا پلا دیتے ہیں اور پھر بیہوش کر کے آگے روانہ ہوتے ہیں۔

حسین: (چونک کر) میں نے بھی اپنے آپ کو کبھی جنگل میں پایا تھا اور کبھی پہاڑوں میں۔ تو اسی طرح میں بھی اِصفہان سے روانہ ہو کے الُموت کے منازِل کو قطع کر رہا تھا؟

زمّرد: اور کیا۔

حسین: (حیرت سے) اور یہ لوگ انسان کو بیہوش کیونکر کرتے ہیں؟

زمّرد: ایک پتی سے، حشیش (بھنگ) اسی کے ذریعے سے۔ کبھی اس کا شربت پلا کے اور کبھی اسے غذاؤں میں اور مٹھائیوں میں ملا کے۔

حسین: (بے صبری سے) تو طُورِ معنیٰ نے جو جامِ شراب پلایا، وہ اسی حشیش کا تھا۔

زمّرد: بے شک۔

حسین: افسوس! مجھے مسکرات بھی پلائے گئے اور کوئی گناہ نہیں جو اُٹھا رکھا ہو۔ تُو ناراض نہ ہو

کیوں کہ صرف وصال کی آرزو نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ ورنہ میں اتنا مجنون اور فاتر العقل نہ تھا۔ محبت کی یہ حالت ہے کہ تیرے بوسے کا نشان جو میری پیشانی پر موجود ہے، مجھے دل و جان سے زیادہ عزیز ہے۔ میری یہ آرزو ہی رہی کہ اس نشان کا بوسہ لے کے اپنے دل کی تسلی کروں مگر یہ مُشتاق ہونٹ کسی طرح وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

حسین کی ان باتوں پر زمّرد کچھ ایسی شرمائی تھی کہ اس کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی دیر تک آنکھیں نیچی کیے رہی اور کئی منٹ کے بعد جذباتِ شرم کو دبا کے بولی "حسین بوسہ لینے سے نہ کسی شخص کے جسم پر داغ بن جاتا ہے اور نہ میں اتنی بے حیا ہوں۔"

حسین: (بات کاٹ کے) اچھا، تمھارے سوا اور کس نے میرا بوسہ لیا ہوگا؟ میں نے کسی کو منہ تک تو لگایا نہیں۔

زمّرد: (نظریں جھپکا کے) اب مجھ سے بے شرمی کی باتیں نہ کہلواؤ۔ یہ تم کو فریب دیا گیا ہے۔ یہ بوسہ کا نشان ہے نہ عشق بازی کی پہچان۔ بلکہ یہ ایک علامت ہے جو ہر اس شخص کی پیشانی پر لوہے سے داغ کر بنائی جاتی ہے، جو اس جنت میں لایا جاتا ہے؟

حسین: داغ ہوتا تو مجھے یاد ہوتا۔

زمّرد: یہ داغ بے ہوش کر کے بنایا جاتا ہے۔ اور جب تم اَلَمُوت سے اِصفہان کی طرف جا رہے ہوگے، اسی وقت بنایا گیا ہوگا۔

حسین: (زور سے سینہ کوٹ کے) افسوس! افسوس! اُگل لینے گئے تھے، داغ لے آئے۔

اس کے بعد حسین دیر تک دل ہی دل میں اپنی حالت پر افسوس کرتا رہا۔ پھر ایک دفعہ چونک کر بولا "زمّرد، افسوس! بڑا دھوکہ ہوا۔ تو نے مجھے اس وقت کیوں نہ جتایا جب میں تیرے پاس لایا گیا تھا۔

اس وقت تُو بھی مجھے یقین دِلا رہی تھی کہ یہ سب ملاءِ اعلیٰ کی چیزیں ہیں۔''

یہ سُن کے زمّرد آبدیدہ ہوگئی اور ایک آواز میں بولی ''میری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ تمھیں دھوکہ دوں گی۔'' زمّرد کو آبدیدہ اور ملُول پا کے حسین کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور بے اختیاری کے ساتھ باوفا معشوقہ کے آنسو پونچھ کے کہنے لگا ''زمّرد، مجھے یہ خیال نہ تھا کہ اس سوال سے تیرے دل کو صدمہ پہنچے گا۔ اچھا، جا۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی ایسی بات نہ پُوچھوں گا۔''

زمّرد: تم زخم پر نمک چھڑکتے ہو۔ اس وقت تک تم نے سب کچھ پوچھا لیکن یہ نہ پوچھا کہ تم سے چُھوٹ کے مجھ کم بخت پر کیا گزری۔ تم تو آزاد تھے۔ دنیا میں پھر رہے تھے۔ مگر آہ! میں قید میں تھی۔ اور کیا کہوں کہ کس عذاب میں مبتلا تھی۔ یہ بات میرے اختیار میں نہ تھی کہ کسی کو راز کا ایک ذرا سا اشارہ بھی دے سکوں۔ (اتنا کہہ کر زمّرد زار و قطار رونے لگی۔)

حسین: (گلے لگا کر اور آنسو پونچھ کے) بے شک مجھ سے غلطی ہوئی کہ ان باتوں کا پوچھنا بُھول گیا مگر سچ کہتا ہوں کہ میں نے اس وقت تک کوئی بات سوچ سمجھ کے نہیں پوچھی۔ جو کچھ پوچھا ہے، میں نے نہیں پوچھا بلکہ حیرت و بیخودی پچھوا رہی تھی۔ ایسی از خود رفتگی کی حالت میں کوئی فرو گزاشت ہوگئی تو معاف کردو۔

زمّرد: خیر اب تم نے یہ داستان چھیڑی ہے تو سنو۔ یہ باغ فدائیوں اور باطنیوں کے اعتقاد میں تو جنت الفردوس اور ملاءِ اعلیٰ کا عشرت کدہ ہے۔ مگر سچ پوچھو تو شاہانِ الُموت کی عشرت کے لیے سراپا حرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈیڑھ سو برس کی متواتر کوشش روز بروز اس کی رونق بڑھاتی ہے۔ اور چونکہ اس سے مذہبی کام لیا جاتا ہے لہٰذا ہر چیز کے بنانے میں یہ کوشش کی گئی کہ اس کی خوش نمائی اور دل فریبی انسان کے حوصلے سے زیادہ اور اس کو محوِ حیرت کردینے کے لیے کافی ہو۔ یہ محل جو دیکھتے

ہو کہ سونے، چاندی، مونگے، موتی کے نظر آتے ہیں صرف نقرئی، طلائی جواہرات کے رنگ دیے گئے ہیں۔ورنہ وہی اینٹ اور چونا ہے جس سے ہر جگہ مکان بنائے جاتے ہیں۔نہروں کے جاری کرنے کا سامان موجود تھا۔ یہ بڑی نہر جو اس باغ کے درمیان میں بھی ہے اور جس پر ایک سنہری پُل قائم ہے، وہی نہر ویرنجان ہے جس کے کنارے تم نے مُدتوں آہ وزاری کی ہے۔

حسین: (حیرت سے) وہی نہر ہے؟

زمّرد: وہی، یہ خاص نہر شاہی قصر سے ہوتی ہوئی یہاں آئی ہے اور یہاں چند ایسی گھاٹیوں میں ہو کے جن میں گزرنا غیر ممکن ہے، اس فرحت بخش وادی میں پہنچ گئی ہے۔

حسین: اور زمّرد! وہ روشنی کیسی تھی جسے تُو نے نور ریز دانی بتایا تھا؟

زمّرد: وہ روشنی صرف یہ تھی کہ اِرد گرد کے پہاڑوں پر رات کو بہت تیز روشنی اور مہتابیاں چھوڑی جاتی ہیں جن کا عکس یہاں کے آئینوں اور شیشوں پر ڈال کے قوی اور تیز کیا جاتا ہے۔ اس روشنی کا سامان صرف اس زمانے میں کیا جاتا ہے جب یہاں کوئی شخص معتقد بنانے کے لیے لایا گیا ہو۔اُس وقت سب کو حکم رہتا ہے کہ جب وہ روشنی تیزی سے چمکے تو چلاّ کے کہیں ہٰذَا الَّذِی مَاوَعَدَنِی رَبِّی ۔اور وہ دوا اور شراب کے حوض بھی اسی ضرورت کے موقع پر لبریز کیے جاتے ہیں۔ لوگوں کا تختوں پر بیٹھنا اور غلمان کا شراب پلانا اور اُن کی بے فکری و خالص مسّرت کے تماشے بھی اِسی موقع پر دکھائے جاتے ہیں۔

حسین: اور یہ طیور کا نغمہ اور اُن کا پھل توڑ توڑ کے لانا؟

زمّرد: یہ کون سی بڑی بات ہے ۔ چند سدھائے طیور چھوڑ دیے گئے ہیں جن کو پھلوں کے توڑ لانے اور بغیر چھیڑے ہوئے لوگوں کے سامنے رکھ کے اڑ جانے کی مشق کرا دی گئی ہے۔ اسی

طرح یہاں کے طیور کو قرآنِ پاک کی یہ آیت ''سلام علیکم طبتم فادخلو ہا خالدین۔'' یاد کرائی گئی ہے جس کو ہر وقت رٹا کرتے ہیں۔

حسین: بڑا گہرا فریب ہے! بھلا کوئی کیونکر سمجھ سکتا ہے۔ اور ہاں، زمّرد! تُو جنت کے راز بتانے میں اپنی سرگزشت کہنا تو بھول ہی گئی۔

زمّرد: میری مصیبت کیا پوچھتے ہو۔ میں ہی تھی جو ان سب آفتوں کو جھیل گئی۔ اور کوئی ہوتا تو اب تک خاک میں مل چکا ہوتا۔

حسین: نہیں، پیاری زمّرد! ایسی باتیں زبان سے نہ نکال۔ میرے دل کو صدمہ ہوتا ہے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے وہ مصیبتیں کٹ گئیں اور ہم پھر ایک دوسرے کے آغوش میں ہیں۔

زمّرد: اصل میں مَیں صرف ایک حُور بنانے کے لیے لائی گئی تھی۔ خورشاہ اور اس کے ہمراز اہلِ دربار کو ہمیشہ کسی خوبصورت عورت کی جُستجُو رہتی ہے تا کہ اس کے حسن و جمال سے جنت میں زیادہ دلچسپی پیدا کریں۔ جب میں خورشاہ کے سامنے پیش کی گئی تو بدنصیبی سے اس کی نظر میں معمول سے زیادہ اور جنت کی تمام حُوروں سے بڑھ کے خُوبصورت ثابت ہوئی۔ اُس نے ارادہ کیا کہ مجھے خاص اپنے لیے مخصوص کر لے۔ میں یہ خبر سُن کے انتہا سے زیادہ پریشان ہوئی اور آخر دل میں فیصلہ کیا چاہے مار ڈالی جاؤں مگر اس بے عزتی کو گوارا نہ کروں گی۔ ابتدا میں مجھے طرح طرح کے لالچ دیے گئے۔ بتایا گیا کہ اُس کی بی بی ہونے کے بعد تاج میرے سر پر رکھا جائے گا اور میں عالی مرتبہ ملکہ ہوں گی، مگر میں نے کسی طرح منظور نہ کیا۔ جب اُسے میری رضامندی سے مایوسی ہوئی تو وہ ظلم پر آمادہ ہوا اور مجھے طرح طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں۔ اڑھائی مہینے اِسی حال میں گزرے۔ ہر گھڑی ہر پل موت کا انتظار کرتی تھی۔

معشوقۂ باوفا کی یہ مصیبتِ وفا کیشی سُن کے حسین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ٹھنڈی سانس لے کے کہنے لگا "زمّرد میرے لیے تو نے بڑی مصیبتیں اُٹھائیں۔"

زمّرد: یہ مصیبت نہ تھی بلکہ میں اس کو راحت سمجھتی تھی۔ اس لیے کہ بے عزّتی اور آبروریزی سے بچی ہوئی تھی۔ اب خورشاہ ناکامی کے غصے میں میرے قتل پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لیکن اتفاق سے کسی دوست نے رائے دی کہ ایسے کام جن کا کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے سے تعلق ہو، ظلم جور اور زبردستیوں سے نہیں نکلتے۔ بہتر ہوگا کہ زمّرد چند روز کے لیے جنت کے ایک محل میں چھوڑ دی جائے۔ وہاں جب ایک عرصے تک راحت وعشرت میں رہے گی تو اپنے رنج وغم بھول جائے گی اور آخر جوانی کے جذبات غالب آ کے اُسے خود ہی آپ کی معشوقہ بننے پر آمادہ کر دیں گے۔ یہ رائے اُسے پسند آئی اور میں اُس کے محل سے لا کے اِس جنت اور اِسی قصر میں رکھ دی گئی۔ یہ ایسا محفوظ مقام ہے کہ خورشاہ کے خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہاں کبھی پرند بھی پر مار سکے گا۔ باہر کا کوئی شخص نہ آ سکتا تھا۔ جو معتقد بنانے کے لیے بھی لائے جاتے تھے تو اُن کی ہر طرف سے نگرانی ہوتی تھی اور کوشش کی جاتی تھی کہ سوائے ایک دو بات کرنے کے میں ان سے زیادہ مل بھی نہ سکوں۔ اوروں پر کیا منحصر ہے، جب تم سے ملی ہوں اس وقت بھی اِن اُمور کی پوری نگرانی ہوتی تھی۔ یہ مجال نہ تھی کہ سوائے تمھارے بہکانے اور بہلانے کے میں تم سے ذرا بھی بے تکلف ہو سکوں۔ اب مجھے ہر بات کا آرام تھا۔ رات دن عیش وعشرت میں گزرتی تھی۔ خورشاہ کے اشارے کے موافق یہاں کی تمام حُوریں میری لونڈیاں بنی رہیں۔ وہ ہر وقت میرا دل بہلانے کی کوشش کرتیں۔ حسین! یہ سب سامانِ عشرت موجود تھا مگر میرے دل کو کسی طرح چین نہ آتا تھا۔ تمھاری صورت ہر گھڑی آنکھوں کے سامنے رہتی اور طرح طرح کی تدبیریں سوچا کرتی تھی کہ

کسی طرح یہاں سے بھاگوں۔ انھی دنوں تمھارے قتل کے بارے میں مشورے ہوتے اور میرا لہو خشک ہوا کرتا۔ ایک رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے ایک لق و دق میدان میں کھڑی ہوں۔ ناگہاں سامنے سے تم آئے اور مجھ سے ملنے کو بے تحاشا دوڑے۔ یکا یک کسی شخص نے ایک درخت کی آڑ سے نکل کر تمھارے سینے میں ایک چُھری ماری۔ تم زخم کھاتے ہی سینہ پکڑ کے کھڑے ہو گئے اور میں بے اختیار روتی اور چیخیں مارتی تمھارے قریب دوڑی۔ پس اسی حال میں چیختے چیختے میری آنکھ کُھل گئی۔ اب کہاں چین پڑ سکتا تھا۔ باقی رات میں نے رو رو کے بسر کی اور صبح کو حیران و پریشان بیٹھی تھی کہ مرجان نام یہاں کی حُور جو مجھ سے کسی قدر مانوس ہو گئی تھی اور جس سے میں کبھی کبھی دو ایک باتیں کر لیا کرتی تھی، میرے پاس آئی اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولی ''زمّرد! تم نے کچھ اور بھی سُنا ہے؟ وہ نوجوان حسین جو تمھارے ساتھ تھا، اب تک اُسی وادی میں تمھاری قبر سے لپٹا بیٹھا ہے۔'' اِس موقع پر مجھے ضبط سے کام لینا چاہیے تھا مگر رہا نہ گیا۔ بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کے بول اُٹھی ''حسین اب تک وہیں ہیں؟''

مرجان: ہاں، مگر اب یقین ہے کہ ایک دو ہی روز میں وہ مقام ان سے خالی ہو جائے گا۔

میں نے گھبرا کے پوچھا ''کیوں''؟

مرجان: وہ مقام ہم لوگوں کی سیر گاہ ہے اور اسی سبب سے خورشاہ چاہتے ہیں کہ وہاں کوئی ایسا شخص نہ رہے جو ہمارا راز نہ جانتا ہو۔ تمھارے ساتھی نوجوان کی نسبت پہلے تو یہ خیال تھا کہ جب بالکل مایوسی ہو جائے گی تو چلا جائے گا۔ اسی غرض سے تمھاری قبر بتا دی گئی ہے۔ پتّھر پر تمھارا نام کندہ کر دیا گیا ہے کہ تمھارے مرنے کا اُسے یقین ہو جائے اور واپس ہو جائے اور لوگوں کو بھی اِدھر آنے سے روکے۔ مگر یہ تدبیر بیکار گئی۔ لہٰذا مجبور ہو کے اب یہ تجویز قرار پائی کہ جس

طرح بنے اس کا کام تمام کر دیا جائے۔

''حسین! میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ جُملہ سنتے ہی میرے دل کی حالت کیا ہوئی، میں گھبرا کے بالکل بے اختیاری کے ساتھ کہہ اُٹھی ''تو پھر مجھے بھی مار ڈالو۔''

میری بدحواسی دیکھ کر مرجان بولی ''اگر اس کو بچانا چاہتی ہو تو ایک کام کرو۔ خورشاہ کے سامنے چل کر خود ہی اپنی زبان سے سفارش کرو۔'' یہ ایسی بات تھی جس کو میں ہرگز نہ ماننا چاہتی تھی۔ فقط اتنے خیال سے کہ تمھاری جان بچتی ہے، طوعاً و کرہاً گئی۔ اور جب اس نے مسکرا کے مجھ سے بات کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے آہ وزاری کے ساتھ کہا ''خدا کے لیے اس نوجوان کی جان نہ لیجیے۔'' میری درخواست سُنتے ہی اس نے نہایت متین صُورت بنائی، مجھے بہت گھور کے غصے کی نگاہ سے دیکھا اور نہایت برہمی کی آواز میں پوچھنے لگا ''وہ تمھارا کون ہے؟''

میں: وہ میرا عزیز ہے۔ اُسی کے ساتھ کھیلتی رہی اور اُسی کے ساتھ پل کے بڑھی ہوئی ہُوں، اور اُسی سے میری شادی ہونے والی ہے۔ اِسی سبب سے اکیلا وہی میری جان و دل کا مالک ہے۔

خورشاہ: تمھاری شادی ابھی اُس کے ساتھ نہیں ہوئی؟

میں نے نظر نیچی کر کے جواب دیا ''نہیں۔''

یہ جواب سُن کے خورشاہ نے مجھے بدگمانی کی مُتجسّس نگاہوں سے دیکھا اور کہا ''مگر شادی سے پہلے ہی تمھارے اُس کے ایسے تعلّقات ہو گئے کہ گھر بار چھوڑ کے ساتھ نکل کھڑی ہوئیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ تمھاری عفّت میں داغ لگ گیا۔''

''اِسکا جواب دیتے وقت مجھے بے انتہا شرم معلوم ہوئی۔ کسی طرح کوئی لفظ میری زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ مگر صرف اپنی اور تمھاری آبرو بچانے کی غرض سے میں نے دل کو کڑا کر کے اور بے حیائی

گوارا کر کے جواب دیا ''میں تو اپنے بھائی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کو اور دوسرے حج کو نکلی تھی۔ مگر ہاں، یہ البتہ ارادہ تھا کہ قزوین پہنچ کے عقد کرلوں گی۔''

خورشاہ: نکاح کی رسم تو قزوین میں ادا ہوتی مگر غالباً تم آپس میں میاں بی بی کے تعلقات پہلے ہی قائم کر چکے تھے۔

''اِس سوال پر میں اس قدر شرمائی کہ سارا بدن پسینے پسینے ہو گیا۔ نیچی نظر کر کے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شرم کے مارے آنکھیں بند کر کے جواب دیا ''نہیں۔ میری عِفت میں فرق نہیں آیا۔'' اتنا سُنتے ہی خورشاہ ایک بے اختیاری کے جوش میں یہ کہتا ہُوا میری طرف دوڑا ''شکر ہے کہ میری نازنین کے پاک جسم کو ابھی کسی کا ہاتھ نہیں لگا۔'' قریب تھا کہ وہ مجھے گلے لگائے مگر میں نے دونوں ہاتھوں سے روکا اور اس کے ہاتھ سے بچنے کے لیے پاؤں کے پاس زمین پر گر کے کہنے لگی ''اُس نوجوان کی جان نہ لیجیے ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' خورشاہ دیر تک سوچتا رہا پھر مجھے اُٹھا کے بولا ''زمّرد! یہ بہت ضروری ہے کہ وادی اُس ضدّی شخص سے خالی کی جائے۔''

میں: آہ! میں نے اُسے وصیت کر دی تھی کہ میں مر جاؤں تو گھر کے عزیزوں کو میری عفّت و پاکدامنی کا یقین دلانا۔ مگر افسوس! اُس نے نہ مانا۔

''یہ سُنتے ہی خورشاہ چونک پڑا اور بولا ''کیا تم نے اُسے گھر جانے کی وصیت کی تھی؟''

میں: جی ہاں۔ وصیت کیسی، بہت تاکید و اصرار کے ساتھ کہا تھا۔

خورشاہ: تو خیر، کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک نہایت عمدہ تدبیر ہے۔ وہ وادی بھی اُس سے خالی ہو جائے گی اور اُسے کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچے گا۔ مگر زمّرد! یہ سب کچھ صرف تمھاری نظرِ محبت کی اُمید پر منحصر ہے۔''

''اس کے جواب میں کچھ کہنا مجھے بالکل بے موقع معلوم ہوا۔خاموش کھڑی رہی۔خورشاہ نے قلم و دوات منگا کے ایک خط کا مسودّہ لکھا اور اُسے میری طرف بڑھا کے کہا ''اِسے تم اپنے ہاتھ سے صاف کر دو''میں نے اُسے اس کے سامنے وہیں بیٹھ کے صاف کر دیا۔ میں واپس نہیں آئی تھی کہ ایک دودھ لانے والی دہکانی کو بُلوا کے خورشاہ نے وہ خط اس کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ تمھاری غفلت میں قبر پر رکھ دیا جائے۔ یہ میرا پہلا خط تھا۔ میں اس حال کا پہلے بھی بیان کر چکی ہوں۔مگر پھر کہتی ہوں کہ کیسے کیسے ظلم ہوئے ہیں اور کیسی کیسی مجبوریاں پیش آئی ہیں، جب میں نے تم کو خط لکھا ہے۔

اس خط کے روانہ ہو چکنے کے بعد جب میں واپس آئی تو انتہا سے زیادہ حیران تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب مجھ سے مایوس ہو کے تم گھر چلے جاؤ گے۔روز اسی اُدھیڑ بُن میں رہتی تھی کہ تمھاری زبان سے میری موت کا قصہ سُن کے امّاں اور ابّا کے دل پر کیسی گزری ہوگی۔کئی ہفتے اسی حالت میں گزر گئے۔وہ حُور جس کا نام مرجان تھا، روز میرے پاس آتی اور ہمیشہ ہمدردی ظاہر کرتی۔مگر مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ خورشاہ کی سکھائی پڑھائی تھی اور اُس سے روز جا جا کے کہہ دیا کرتی تھی کہ میں تمھارے لیے کس قدر حیران رہتی ہوں۔ایک دن اُس نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ زمّرد، تمھارا مکان آمل میں ہے؟ میں چونک کے بولی ہاں کیوں؟''

مرجان: وہیں کے ایک زبردست عالم جو فی الحال نیشا پور میں رہتے ہیں، لوگوں کو ہمارے خلاف بہکار ہے ہیں اور اس کو جنتِ فریب بتاتے ہیں۔

میں: کون؟ اِمام نجم الدین نیشا پوری تو نہیں؟

مرجان: ہاں، وہی۔اُن کے قتل کی تجویز ہو رہی ہے۔

میں: (چونک کر) ہائے! یہ تو بڑا ظلم ہے۔ وہ بڑے باخدا عالم ہیں۔ حسین کے اُستاد ہیں اور اُنھیں کے وہ مُرید ہیں۔

مرجان: (تعجب سے) حسین ان کے شاگرد اور مُرید ہیں؟

میں: اتنا ہی نہیں بلکہ اُن کے بھتیجے بھی ہیں۔

اِس کے بعد میں دل میں افسوس کرتی رہی کہ یہ ظالم ناحق ایک باخدا شخص کی جان لیتے ہیں اور انھی خیالات کی وجہ سے میں نے رات کوئی پریشان اور مہیب خواب دیکھے۔ دوسرے دن اُٹھی ہی تھی اور آفتاب اچھی طرح بلند نہیں ہونے پایا تھا کہ مرجان آئی اور کہنے لگی ''چلو'' زمّرد! تمھیں خورشاہ نے بُلایا ہے۔''

میں: (پریشانی کی صُورت بنا کے) کیوں؟

مرجان: میں کیا جانوں۔ مگر اسی وقت چلو۔

مجبوراً میں اُس کے ساتھ گئی اور وہاں جا کے دیکھا کہ وہ تو ایک خوبصورت لڑکی کے ہاتھ سے جامِ شراب پی رہا ہے۔ میری صورت دیکھتے ہی بولا۔

خورشاہ: تم کسی طرح حسین کے خیال کو نہیں چھوڑتیں۔ اگر میری آرزو پوری کرنے کا اقرار کرو تو تمھیں اُس سے ملا دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔

یہ الفاظ سُنتے ہی میرے دل میں ایک خفیف سی مسرت پیدا ہوئی۔ مگر اُس کی شرط بالکل ایسی تھی جیسے شربت کے جام میں زہر مِلا ہوتا ہے۔ میں نے کسی اور خیال کو دل میں دبا کے کہا ''اگر آپ کے رحم نے مجھے اُن سے ملا دیا تو زندگی بھر لونڈی رہوں گی۔''

میرے اس جواب سے وہ خوش ہوا اور فوراً ایک دوسرے خط کا مسوّدہ دے کے کہا ''اِسکو اپنے قلم

سے صاف کر دو۔'' میں نے مسوّدہ ہاتھ میں لے کے پڑھا اور خورشاہ کی طرف دیکھ کے پوچھا'' اب تو حسین اس وادی سے چلے گئے ہوں گے۔''

خورشاہ: نہیں۔ اُس نے تمھارے خط کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ اُسی طرح قبر کا مجاور بنا بیٹھا ہے۔تم اُسے باوفا اور سچّا عاشق سمجھتی تھیں، مگر وہ تمھاری پروا بھی نہیں کرتا۔ اس دل کش وادی میں اس کا ایسا دل لگ گیا ہے کہ اب تمھارے حکم کو بھی نہیں مانتا۔

میں: نہیں۔ وہ ایسے ہی باوفا ہیں جیسا کہ میں سمجھتی ہوں۔ جس طرح میری جُدائی گوارہ نہ تھی اسی طرح اب اُنھیں میری قبر کی مفارقت گوارا نہ ہوگی۔

حسین: (جوش میں آکے) بیشک زمّرد! صرف اسی خیال سے میں نے تیرا حکم نہیں مانا۔

زمّرد: خیر، میری زبان سے یہ باتیں سُن کے اس نے ایک حیرت کے ساتھ گھور کے دیکھا اور کسی قدر پست آواز میں بولا'' یہ مسوّدہ جلدی صاف کر دو کہ وہ تم سے ملنے کا سامان کرے، مجھے اُس مسوّدے کے پڑھتے ہی حیرت ہوگئی۔ پڑھتی جاتی اور دل میں کہتی جاتی تھی کہ یہ لوگ کس قدر مکّار اور فریبی ہیں۔ بہر حال، میں نے خط صاف کر کے دے دیا اور چلی آئی۔ دوسرے دن مجھے مرجان کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ خط تمھارے پاس بھیج دیا گیا اور اس سے یہ غرض تھی کہ تمھیں شیخ علی وجودی کا معتقد بنا کے انھی کے ذریعے سے امام نجم الدین نیشاپوری تمھارے ہاتھ سے قتل کرائے جائیں۔ اِس صلے میں تم جنت کی سیر کرو اور مجھے تم سے ملنے کا موقع ملے۔ حسین! کیا کہوں۔ یہ معلوم ہوتے ہی میں نے اپنے اوپر کتنی لعنت ملامت کی۔ دل میں ڈرتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے تم اُن کے خون میں اپنے ہاتھ رنگ لو۔ دعا کرتی تھی کہ خدا کرے پہلے خط کی طرح تم اِس خط پر بھی عمل نہ کرو۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہاں کے بھیجے ہوئے گدھے پر سوار ہو کے تم روانہ

ہو گئے تو دل میں اور ڈری اور دعا کرنے لگی کہ خداوند! حسین کو اس گناہ سے بچا۔ مگر بعد مدّت کے جب معلوم ہوا کہ اب دو تین دن میں جنت میں آیا چاہتے ہو، مجھے یقین ہو گیا کہ تم ان ظالموں کے پھندوں میں پھنس گئے ہو۔ جب تم اُس وادی کو چھوڑ کے چلے گئے تو یہاں کی حُوریں اکثر اوقات سیر و تفریح کی غرض سے وہاں جانے لگیں، جن کے ساتھ خورشاہ کی اجازت سے میں بھی کبھی چلی جاتی تھی اور اپنی قبر کو دیکھ کے تمھارے خیال سے اکثر ہی دل ہی دل میں روتی تھی۔

جب تم جنت میں آئے، اس سے پہلے مجھے بتا دیا گیا کہ تم سے کیوں کر ملوں، کس قسم کی باتیں کروں اور تمھارے اعتقاد کو کس طرح بڑھاؤں۔ اُمید تھی کی اس کے ذرا بھی خلاف ہوا اور ذرا سا بھی راز تم پر ظاہر ہو گیا تو تم سے پہلے میں مار ڈالی جاؤں گی۔ پھر ہر وقت یہاں میری اور تمھاری نگرانی ہوتی رہتی تھی اور مجھے تم سے ایک لفظ بھی کہنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے تمھاری یہ حالت نظر آئی کہ جیسے تم پر کوئی جادو چلا ہوا تھا اور اپنے ہر نیک و بد سے بے خبر تھے۔ ایسی حالت میں اس کی اُمید نہ تھی کہ تم سے کچھ کہوں گی تو تم اُسے ضبط کر کے چُھپا سکو گے۔ اسی خیال سے میں نے کچھ نہ کہا۔ تاہم موقع پا کے اتنا بتا دیا تھا کہ نااُمیدی کی حالت میں میری قبر پر آنا اور آخر اسی تدبیر سے خدا نے کامیاب کیا۔ مگر حسین! میں نے خورشاہ کے ہاتھ سے تمھارے لیے بڑے بڑے ظلم اُٹھائے۔ برائے نام اِس جنت میں تھی۔ تمھارے جانے کے بعد اور زیادہ سختیاں ہوئیں۔ اب خورشاہ کو خیال ہو چکا تھا کہ میں کبھی اِس کے موافق نہ ہوں گی۔ مگر لوگوں کے کہنے سننے اور اس کے دلی میلان کا نتیجہ تھا کہ اس وقت تک زندہ ہوں۔

حسین: (زمّرد کو گلے لگا کر) غنیمت ہے کہ اتنی مصیبتوں کے بعد ہم پھر مل گئے۔ مگر اب مجھے ضرورت ہے کہ ان ظالموں سے ان باتوں کا انتقام بھی لوں۔ جب تک انتقام نہ لوں گا

تب تک چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوگا۔ میرے گناہوں کا کفارہ یہی ہے کہ دنیا کو خورشاہ، علی وجودی اور طورِ معنیٰ کی نجاست سے پاک کروں۔ جس طرح ابھی ان لوگوں کا فدائی تھا، اب دین کا سچا فدائی رہوں گا۔ ان کے مستقر پر جاؤں گا اور اسی بہانے سے ان لوگوں کو جنت کی بجائے دوزخ میں بھیجوں گا۔

زمّرد: تمھیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ فی الحال عیدِ قائمِ قیامت ہے۔ یہ سب لوگ یہیں آئے ہوئے ہیں۔ اِسی قلعے میں موجود ہیں۔ اور ان کی سزا دہی کا بھی پورا انتظام ہو گیا ہے۔
آج ہی شام تک تمھیں موقع مل جائے گا کہ شہزادی بلغان خاتون کے ساتھ خورشاہ کے محل میں اور قلعے میں گھس کے ایک ہی وقت تینوں کا کام تمام کرو۔

حسین: زمّرد! تجھے یہاں کے حالات کیونکر معلوم ہو گئے؟

زمّرد: حُوروں اور جنت والوں سے کوئی راز چُھپا تھوڑا ہی ہے۔ مرجان کی طرح یہاں کی بعض حُوریں خورشاہ کے محل میں جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک دو ہر وقت اس کی صحبت میں موجود رہتی ہیں۔ یہ حُوریں جب واپس آتی ہیں تو جو کچھ دیکھتی سنتی ہیں، دوسروں سے کہہ دیتی ہیں۔ اِس طرح تھوڑی دیر میں ہر بات سب میں مشہور ہو جاتی ہے اور کسی نہ کسی ذریعے سے میں بھی سُن لیتی ہوں۔ اور ہاں حسین! یہ تو بتاؤ کہ شہزادی کے ساتھ فوج کتنی ہے؟

حسین: فوج؟ تھوڑے سے جوان ہوں گے۔

ناگہاں ایک شور اور ہنگامے کی آواز بلند ہوئی۔ دونوں گھبرا کے محل سے باہر نکل آئے اور سپاہیوں کا عظیم الشّان لشکر دیکھ کے اس کے محل کی طرف دوڑے جہاں شہزادی بلغان خاتون آرام کر رہی تھی۔

نواں باب

انتقام

حسین اور زمرّد نے اپنے قصر سے نکل کے دیکھا تو عجب عالم نظر آیا۔ جنت کے آرام و اطمینان میں فرق آ گیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا فردوسِ بریں میں قیامت آ گئی ہے۔ خوبُرو اور پری چہرہ حُور و غلمان جو اپنے حسن و جمال سے ہر ایک کو نورانی پیکر ہونے کا دھوکہ دیتے تھے، قصروں اور کوشکوں سے نکل نکل کے بدحواس بھاگے اور ایک دوسرے کی آڑ میں چھپنے لگے۔ ہر طرف تہلکہ پڑ گیا۔ جہاں رونا حرام بتایا جاتا تھا، وہیں ہر طرف رونے پیٹنے اور نوحہ وُبکا کی آواز بلند ہوئی۔ ایک عظیم الشّان اور بڑا بھاری تاتاری لشکر جنت میں داخل ہو گیا تھا، جس کے سپاہی ہر چہار طرف پھیلتے جاتے تھے۔ قصروں اور کوشکوں میں لوٹ مار مچ گئی تھی۔ خوبصورت لڑکیاں اور پری جمال لڑکے گرفتار ہو رہے تھے، جن کی سہمی ہوئی صورتوں اور چیخ و پکار کی آوازوں سے عجیب نازک گھڑی کا سماں پیدا ہو رہا تھا۔ یہ وحشت انگیز اور بدحواس کرنے والا سماں دیکھتے ہی زمّرد اور حسین دوڑے ہوئے اس کوشک میں پہنچے جہاں شہزادی بلغان خاتون آرام کر رہی تھی۔ زمّرد شہزادی کی آرام گاہ کے قریب پہنچ کے دستک دینے کو ہی تھی کہ ایک وحشی اور غارت گر تاتاری اُس کی طرف جھپٹ پڑا۔ حسین کے پاس کوئی ہتھیار تو نہ تھا، وہ اپنی فدائیت کا خنجر لے کے دوڑا۔ قریب تھا کہ اُس میں اور تاتاری میں لڑائی ہو جائے کہ ناگہاں کمرے کا دروازہ کُھلا اور خوبصورت شہزادی بلغان خاتون اپنے بکھرے ہوئے اور لٹکے ہوئے بالوں کے ساتھ باہر نکلی اور تاتاری زبان میں چلّا کے بولی ''ٹھہرو!'' شہزادی کی صورت دیکھتے ہی تاتاری دوڑ کے اس کے قدموں پر گر پڑا اور عرض کیا کہ ہم حضور کی تلاش میں تھے۔

شہزادی: تم میرے ساتھ والوں میں سے ہو؟

تاتاری: نہیں۔

شہزادی: (خوش ہو کے) بھائی آ گئے؟

تاتاری: جی ہاں۔

ناگہاں تاتاریوں کا ایک بڑا غول نظر آیا جن کے درمیان میں خود ہلاکو خان بھی موجود تھا۔ شمشیر برہنہ اُس کے ہاتھ میں تھی۔ ہلاکو خان کو آتے دیکھ کے بلغان خاتون استقبال کو دوڑی۔ بہن بھائی جوش و خروش اور گرم جوشی سے ملے۔ وحشی اور غارت گر جوانوں نے ایک گھڑی کے لیے مُہذّب بن کے اور مُرتّب ہو کے اپنی حسین و نازنین شہزادی کو سلام کیا اور ہر طرف سے خوشی و مسّرت کے نعرے بلند ہونے لگے۔

بلغان خاتون: (ہلاکو خان سے) بھائی۔ آپ کب آئے؟ مجھے تو تردّد ہو چلا جاتا تھا۔

ہلاکو خان: تم کہتیں اور میں نہ آتا؟ اس میں شک نہیں کہ اس وقت سُلطان ویلم کے تعاقُب میں عُجلت کرنے کی ضرورت تھی مگر تمھارا خط دیکھتے ہی مجبور ہونا پڑا۔ میں نے تھوڑی سی فوج اُس کے تعاقُب میں چھوڑ دی اور باقی لوگوں کو ساتھ لے کے چلا آیا۔

بلغان خاتون: میں روانہ ہونے سے کئی دن پہلے آپ کو اطلاع دے چکی تھی۔ اسی خیال سے زیادہ فوج اپنے ہمراہ نہیں لائی۔ لیکن آج صبح جو آپ کے پہنچنے میں دیر ہوئی تو میرا تُردّد بڑھتا جا رہا تھا۔

ہلاکو خان: میں نے بہت کوشش کی کہ صبح تڑکے پہنچ جاؤں مگر کسی طرح نہ پہنچ سکا۔ خیر، اب بھی چنداں دیر نہیں ہوئی۔

اس کے بعد بلغان خاتون نے زمرّد اور حسین کو ہلاکو خان کے قدموں پر گرایا اور کہا ''یہی وہ لوگ ہیں جن کی مدد سے میں یہاں تک آ سکی۔'' ہلاکو خان نے انھیں اُٹھا کے گلے سے لگایا اور کہا ''اپنی بہن کی طرف سے میں بھی شکرگزار ہوں۔''

دونوں نے جھک کے اس کے قدم چومے اور کہا ''حضُور ہی کی توجہ سے ہم کو اس قید خانے سے نجات ملی ورنہ زندگی بھر نجات کی کوئی اُمید نہ تھی۔

بلغان خاتون: اور بھائی! آپ کے ہمراہ کتنی فوج ہے؟

ہلاکو خان: میں پچاس ہزار فوج لے کے چلا تھا۔ راستے میں وہ چالیس ہزار جوان اور خُدا مل گئے

جو تمھارے ساتھ آئے تھے۔ اب کُل نوّے ہزار تاتاری میرے ہمراہ ہیں۔ مگر ان میں سے صرف پانچ ہزار آدمی اندر لایا ہوں۔ اس لیے کہ راستے کی دشواریوں کے باعث اس سے زیادہ فوج کا یہاں لانا غیر ممکن تھا۔

بلغان خاتون: اور باقی ماندہ فوج نہر کے کنارے پڑی ہوگی۔

ہلاکو خان: نہیں۔ میں نے کئی منزل پیشتر سے اپنی فوج کے چالیس ہزار آدمی قلعہ المؤت پر بھیج دیے تھے جو آج ہی پہنچ گئے ہوں گے اور قلعے کے اندر سے ہماری طبل و قرنا کی آواز سنتے ہی یورش کریں گے۔ نہر ویرنجان کے کنارے پہنچ کے جب معلوم ہوا کہ زیادہ آدمی یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تو میں نے طوبی خان کو باقی ماندہ فوج کا سردار مقرر کر کے حکم دیا کہ وہ بھی المؤت ہی پر جا کے حملہ کرے۔ اس کے ساتھ ۴۵ ہزار فوج ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ یہ لوگ وقت پر نہ پہنچ سکیں گے۔ مگر اتفاقاً خوش قسمتی سے ایک یہیں کا کوہستانی شخص مل گیا جس نے بتایا کہ المؤت بہت قریب ہے۔

زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹے میں پورا لشکر وہاں پہنچ سکتا ہے۔ طوبیٰ خان اُس شخص کو ساتھ لے کے گیا ہے اور یقین ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ بھی قلعے کے پھاٹک پر پہنچ گیا ہوگا۔ خیر یہ بتاؤ کہ قلعے کا راستہ کدھر ہے؟

بلغان خاتون: تو بھائی، تھوڑی دیر ٹھہر کے سستا لو، پھر چلنا۔ تم ابھی منزل مارے اور تھکے ماندے چلے آ رہے ہو۔

ہلاکو خان: (ہنس کے) ہمارا آرام اسی میں ہے کہ جوہرِ شجاعت دکھانے کو کوئی اچھا میدانِ جنگ ملے۔ جب تک فتح حاصل نہ ہو لے، اس وقت تک کوئی چیز ہماری تھکان کو نہیں مٹا سکتی۔ ہاں البتہ تمھارے تھکنے کا مجھے لحاظ ہوتا۔ مگر تم مجھ سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکی ہو اور اچھی طرح سستا چکی ہو۔ لہٰذا اب کسی بات کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔

حسین: (جوش و خروش سے قدم آگے بڑھا کے) حضور! بے شک انتظار نہ کرنا چاہیے۔ مُجھے اِن لوگوں نے اِتنا فریب دیا ہے اور میرے ہاتھ سے ایسے گناہ کرائے ہیں کہ جب تک اِن میں سے خاص تین شخصوں کی جان نہ لے لوں گا، چین نہ پڑے گا۔ ہر وقت میرے دل سے انتقام کی آواز نکلتی ہے۔ پریشان ہوا جاتا ہوں۔

ہلاکو خان: (مسکرا کے) ہاں، ذرا بیان تو کرو کہ تمھیں کیوں فریب دیا گیا تھا؟

شاہی حکم کی تعمیل میں حسین نے اپنی سرگزشت مختصر الفاظ میں بیان کی اور آخر میں آبدیدہ ہو کہ کہنے لگا "افسوس! زمرد کی محبت کے نام سے اتنے بڑے اور ایسے فریب دیے گئے ہیں کہ جب تک زندہ ہوں اپنے اوپر لعنت کروں گا۔

ہلاکو خان: (حیرت سے) واقعی، ان لوگوں نے دنیا کو مکاری اور ریاکاری کا عجب جال ڈال رکھا

ہے اب اس قلعے کی فتح کے بعد میرا ارادہ ہے کہ ملاحدہ کی نجاست سے ساری دنیا کو پاک کردوں ۔

حسین: اگر ایسا ہوا تو خدا تعالیٰ آپ سے بہت خوش ہوگا اور دنیا ہمیشہ کے لیے آپ کے مبارک اسلحہ کی ممنونِ احسان رہے گی۔

ہلاکو خان: تو چلو۔اب تاخیر میں نقصان ہے۔ہماری فوج جو قلعہ کے گرد ٹھہری ہوئی ہے متردّدو پریشان ہوگی۔

زمّرد: یہ کام میرے ذمے ہے، حضور! آپ کی اس لونڈی کے سوا کوئی اس راستے سے واقف نہیں ہے۔مگر اپنے ہمراہیوں کو حکم دیجیے کہ جب تک محل کے اندر نہ داخل ہولیں، نہایت خاموشی سے چلیں۔ پہلے سے خبر ہوگئی تو محل سرائے کا پھاٹک بند کرلیا جائے گا اور پھر قلعے کی طرف جانے میں بڑی بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔

زمّرد کی ہدایت کے مطابق ہلاکو خان نے اپنے تمام ساتھیوں کو ساکت و صامت اور آہستہ قدم اُٹھانے کا حکم دیا۔وہ پانچ سو تاتاری جو قراقرم سے شہزادی کے ہمراہ آگئے تھے اور اب اس پانچ ہزار فوج کے بعد وہ جنت کے اندر داخل ہو گئے تھے، وہی جنت میں چھوڑ دیے گئے تا کہ اسیر شدہ حُور و غلمان کی حفاظت کریں۔ ہلاکو خان الُموت کے قصرِ شاہی کی طرف اس شان سے روانہ ہوا کہ آگے آگے حسین تھا۔اب اسے کسی تاتاری جوان سے ایک تلوار مل گئی تھی، جسے وہ غضب اور انتقام کے ارادے سے علم کیے ہوئے تھے۔اُس کے پیچھے خود ہلاکو خان تھا جس کی داہنی طرف بلغان خاتون تھی اور بائیں طرف زمّرد تھی اور اُن کے پیچھے پانچ ہزار تاتاریوں کا غول تھا، جو باوجود ازدحام و جوش وخروش کے نہایت ہی سکوت و متانت کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا جاتا تھا۔

نہر ویرنجان کے اس طرف تمام چمن اور دل کش قطعاتِ باغ طے کر کے یہ پُر سکوت گروہ سنہری پُل پر پہنچا۔ زمّرد نے بڑھ کر پُل کا قفل کھولا۔ آج صبح ہی کو راستہ روکنے کے لیے اس پُل میں قفل ڈال دیا گیا تھا۔ پُل کا پھاٹک کھلتے ہی سب نہر سے اُتر اُتر کے ایک پر فضا اور دل کش مرغزار میں داخل ہوئے اور زمّرد کے بتانے کے موافق ایک خوش نما اور خوش گوار راستے سے گزر کر بڑے بڑے سایہ دار درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچے۔ انھیں درختوں کے گھونگھٹ میں رکن الدین خور شاہ کے محل سرا کا خوبصورت دروازہ چھپا ہوا تھا۔ دروازے کی صورت دیکھتے ہی یہ لوگ دوڑ کے اندر گھس گئے اور قبل اس کے کہ کسی کو خبر ہو، ایک طولانی ڈیوڑھی کو قطع کر کے خوش نما اور فرحت بخش خانہ باغ میں جا پہنچے جو اپنی شادابی اور دلکشی میں الموت کی جنت سے کم نہ تھا۔

اِن خلل اندازوں کی صورت دیکھتے ہی چند سپاہی جو پہرے پر متعین تھے، اپنا اسلحہ لے کے دوڑے ۔ مگر جب دیکھا کہ تاتاریوں کا ایک لشکر ہے تو وہ بدحواس بھاگے۔ دو چار مارے گئے اور بقیّۃ السّیف نے بھاگ کے سارے محل اور قلعے میں ہل چل ڈال دی۔ قلعے میں مذہبی عید کی رسمیں بجا لائی جا رہی تھیں اور بیرونی اور نیز یہاں کے لوگوں کا بڑا بھاری مجمع تھا۔ اگر حواس سے کام لیا جاتا تو ممکن تھا ایک معرکے کی لڑائی ہوتی۔ مگر تاتاریوں کی ہیبت اُن دنوں ساری دنیا میں بیٹھی ہوئی تھی ۔ اُن کے قلعے میں داخل ہو جانے کا سُنتے ہی سب کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔ خود خور شاہ جو کھڑا خُطبہ پڑھ رہا تھا، ممبر سے اُتر کر بدحواس بھاگا کہ کسی کونے میں جا چُھپے۔ مگر جانے نہ پایا تھا کہ محل کی نازک اندام اور پری جمال عورتیں برہنہ پا بھاگ بھاگ کے آتیں اور قدم پر اُس کے دامن سے لپٹ کے پناہ مانگتی تھیں۔ اس وقت یہاں اس کی خبر نہ تھی کہ قلعے کے گرد سے بھی ایک بڑا بھاری اور عظیم تاتاری لشکر محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ بادشاہ اور مُعتقدوں کو بدحواس دیکھ کے تمام سپاہی اور

اہلِ قلعہ، داعی اور فدائی قلعے کے پھاٹک کھول کے بز دلی اور خوف کی آوازیں بلند کرتے ہوئے باہر نکلے، جن کے نکلتے ہی قلعے کے اندر مُغلی طبل اور قرنا بجی اور تاتاریوں کے باہر والے تاتاری لشکر نے قومی باجوں کی آواز سنتے ہی خود اپنا طبل بجایا اور فوراً حملہ کر دیا۔ بھاگ کے باہر جانے والے، تاتاری لشکر کے مُتلاطم سمندر کو ایک طوفان کی طرح اپنی طرف آتے دیکھ کر نہایت ہی از خود رفتگی کے ساتھ اُلٹے پھرے، جن کا طوبیٰ خان کے لشکر نے بڑی پھرتی سے تعاقب کیا اور باہر کے جان بازوں کو قتل کرتے ہوئے قلعے کے اندر گھس پڑے۔

اب قلعے کے اندر سخت طوفان بپا تھا۔ ہر طرف قتل عام کا سا سماں نظر آ رہا تھا۔ بوڑھے بچے، زن و مرد، اہلِ حرفہ اور سپاہی سب بلا استثنا اور امتیاز قتل ہو رہے تھے۔ ایک عجیب ہنگامہ تھا جس میں تیرا ور نیزے، تلوار اور چھُری اور گُرز اور تبر کی ہولناک آوازوں کے ساتھ تاتاری لُٹیروں کی وحشت ناک چیخیں، عورتوں اور بچوں کی آہ وزاری اور رونے پیٹنے کی آوازیں ایک ساتھ سنی جاتی تھیں۔

ہلاکو خان اور بلغان خاتون کے ہمراہی خورشاہ کے محل میں ایک ایک دالان میں گھس کے خوفزدہ عورتوں، مردوں بوڑھوں اور بچوں کو نکال نکال کے ہنکاتے ہوئے اُس بڑے میدان میں لائے جس جگہ چند منٹ پہلے عید کا جشن ہو رہا تھا اور عیش و مُسرت کے پُر جوش نعرے بلند ہو رہے تھے۔ دوسری طرف سے بھاگنے والوں کو طوبیٰ خان کے ہمراہیوں نے نہایت ہی بدحواسی کے ساتھ ہنکا کے اندر کیا۔ وہ بھی اسی میدان میں آ کے مظلوم و پریشان حال دوستوں سے اندھوں کی طرح ٹکرانے لگے۔ کسی کو اپنے پرائے کا ہوش نہ تھا۔ ہر شخص کے حواس غائب تھے۔ اور دشمن میں سے کسی کو پاتا تھا، مجنون یا ڈوبنے والوں کی طرح اُس کے دامن سے لپٹ کے پناہ مانگتا۔ یہ دل خراش منظر زمّرد کے دل پر نہایت ہی اثر کر رہا تھا۔ وہ ان لوگوں کی بے کسی دیکھ کے رو اُٹھتی تھی۔

کئی مرتبہ قلعے کی بعض ستم زدہ عورتوں کے ساتھ اُس کی زبان سے بھی چیخ کی آواز نکل گئی۔ زمّرد کی پریشانی دیکھ کے بلغان خاتون اُس کے قریب آئی اور کہنے لگی "زمّرد! میں جانتی کہ تمھارا دل اس قدر کمزور ہے تو تم کو یہاں ہرگز نہ لاتی۔"

زمّرد: (رو کے) شہزادی، یہ سب میرا کیا ہوا ہے۔ جو خون کا قطرہ اس وقت قلعے میں گر رہا ہے اور گرے گا، اُس کے گناہ میں میرا نام بھی لکھا جائے گا۔ اور ممکن نہیں کہ اس کے انتقام سے بچ سکوں ۔

بلغان خاتون: یہ صرف تمھارے دل کا بوداپن ہے ورنہ ان لوگوں کا قتل کرنا گناہ نہیں۔ ذرا یہ تو خیال کرو کہ اس وقت ہم کیسے کیسے مقدس بزرگوں اور نامور لوگوں کا بدلہ لے رہے ہیں۔ جتنے لوگ یہاں مارے جائیں گے، ان سے زیادہ روحیں اس وقت خوش ہو رہی ہوں گی اور ہمارے لیے خدا سے مغفرت کی خواستگار ہوں گی۔

زمّرد: (ہچکیاں لے کے) جو کچھ بھی ہو مگر شہزادی مجھ سے یہ ظلم و جور نہیں دیکھا جاتا۔

بلغان خاتون: جب یہ ظلم و جور دل پر اثر کرے تو اُن مظالم کو یاد کرو جو اِن ظالموں کے ہاتھوں دنیا پر ہوتے رہے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر میں قلعے کی نصف سے زیادہ آبادی قتل ہو گئی۔ لاشیں ہر طرف تڑپ رہی تھیں۔ ہر طرف سے پھڑکتی ہوئی آتیں، ایک مقام پر بہت سی جمع ہو جاتیں اور ایک دوسری کو ملاتیں اور باہم لپٹ لپٹ کے اچھلتی تھیں۔ مگر قاتلوں کا خیال بھی اس طرف نہ جاتا تھا۔ وہ برابر بے سر دھڑوں کو گرا گرا کے انھیں تڑپتی ہوئی لاشوں کے تودوں کی طرف بڑھا رہے تھے۔

اب ہلاکو خان اسی ممبر پر کھڑا تھا جس سے خورشاہ خُطبے کو ناتمام چھوڑ کے اُترا تھا۔ برہنہ و خون آلود

تلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ اور اُس کی بہن شہزادی بلغان ممبر کے نیچے اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ حسین اگر چہ فوجی آدمی نہ تھا۔ مگر اسے انتقام کا پورا موقع ملا تھا اور دل کی آگ ملاحدہ کے قتل کی پیاس کو تیز کر رہی تھی۔ تاتاریوں کی بھیڑ میں گھس گھس کے وہ ان خاص لوگوں کو ڈھونڈتا پھرتا تھا جنھیں اس نے پہلے سے اپنا شکار تجویز کر لیا تھا۔ ناگہاں ایک شخص دوڑ کے اُس کے دامن سے لپٹ گیا اور اس کے منہ سے آواز نکلی:

''حسین مجھے بچا۔ میں جانتا ہوں کہ تُو شجرِ معرفت کی ایک شاخ ہے۔'' حسین سمجھ گیا کہ یہ کاظم جنوبی ہے۔ دل میں آئی کہ ایک ہی وار میں اُس کا سر اُڑا دے مگر خود ہی سوچا کہ اس سے طورِ معنیٰ اور علی وجودی کا پتا لگ جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی ذرا دوستی کی شان سے کاظم جنوبی کی طرف جُھک کے پُوچھا ''طورِ معنیٰ کہاں ہے؟''

کاظم جنوبی نے یہ الفاظ سنتے ہی سر اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا اور ایک شکستہ حال بڈّھے کی طرف جو کئی آدمیوں کے درمیان زمین پر ننگے سر بیٹھا تھا، اشارہ کیا اور پھر زمین پر گر کے کہنے لگا '' اے شجرِ معرفت! مجھے پناہ دے۔'' حسین نے غضب آلود تیوروں سے اس کی ذلیل خوشامد کو دیکھا اور یہ کہہ کر کہ تجھ جیسے ذلیل فریبی کے لیے پناہ نہیں ہے، اُس کا سر اُڑا دیا۔

کاظم جنوبی کو تڑپتا چھوڑ کے وہ اس بڈّھے کی طرف گیا اور دیر میں پہچان سکا کہ طورِ معنیٰ وہی ہے۔ حسین نے اس مجمع کے اندر ہاتھ ڈال کے اُسے باہر کھینچا اور کہا ''آج تو میں نے ستّر ہزار حجاب خود ہی چاک کر ڈالے اور طورِ سینا کو بے حجاب دیکھ رہا ہوں۔'' یہ جملہ سنتے ہی طورِ معنیٰ نے حیرت و استعجاب سے حسین کی طرف دیکھا اور کہا ''اے نوجوان! تو کون ہے کہ رمزِ حقیقت سے آگاہ معلوم ہوتا ہے؟''

حسین: ہاں، خوب آگاہ ہوں۔ مگر آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا؟

طورِ معنیٰ: نہیں، بالکل نہیں۔

یہ جواب سنتے ہی غصے میں آ کے حسین نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور کہا ''یا تو وہ کشف تھا کہ بغیر اس کے کہ میری صورت دیکھے اور میری آواز سُنے تُو نے کہا تھا، اے نوجوانِ آلِ علی، مرحبا۔ یا آج مجھے دیکھ کے بھی نہیں پہچان سکا؟ تیری سب سازشیں کُھل گئی ہیں اور معلوم ہو گیا کہ تو کتنا بڑا مکار و بد معاش ہے۔'' اس جواب پر طورِ معنیٰ جُھک کر حسین کے قدم چُومنے لگا اور رِقّت و بدحواسی کی آواز میں بولا ''رحم، جوانِ آلِ علی۔''

حسین: ہرگز نہیں۔ تو ایک فتنہ ہے جس سے دنیا کو جہاں تک ہو سکے جلد خالی کرنا چاہیے۔

یہ کہہ کر حسین طورِ معنیٰ کے سینے پر چڑھ بیٹھا، تلوار زمین پر ڈال دی اور کمر سے خنجر نکال کے بولا ''یہی وہ فدائیت کا خنجر ہے جو میری کمر میں بندھوایا گیا تھا۔ اسی سے میں نے امام ناصر الدین احمد کے سے نیک نفس بزرگ کی جان لی تھی، اور اسی سے تیرا ناپاک سینہ چاک کرنا چاہتا ہوں۔'' طورِ معنیٰ کچھ کہنے کو تھا کہ حسین کا خنجر اس کے سینے میں اتر گیا اور ایک ہی وار میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ایک آہ کے ساتھ جان دے دی۔ حسین اپنی تلوار لے کے اُٹھ کھڑا ہوا، مگر اچھی طرح کھڑا نہیں پایا تھا کہ دیکھا کہ کس قدر فاصلے پر ہلاکو خان کے قریب ہی ایک تاتاری ایک ضعیفُ العمر بڈّھے کو اُس کے عمامے سے باندھ کر کھینچ رہا ہے۔ حسین اُسے دیکھتے ہی پہچان گیا کہ علی وجودی ہے۔ بے اختیار دوڑا اور پگڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے چلّایا ''یہ میرا مجرم ہے۔''

تاتاری: کیوں؟ گرفتار میں نے کیا اور مجرم تُمھارا ہو گیا؟

حسین: ہاں! اس لیے کہ یہ میرا قدیمی مُجرم ہے۔

اس جُملے کے ساتھ ہی ہلاکو خان نے اُس تا تاری کو اشارہ کیا کہ اِس قیدی کو حسین ہی کے سپُرد کر دے۔ حسین نے علی وجودی کو اسی طرح اُس کے عمامے کا ایک جھپکا دے کے دریافت کیا ''مجھے پہچانا!''

علی وجودی کچھ ایسی مایوسی اور از خود رفتگی کی حالت میں تھا کہ اس وقت اس نے دیکھا ہی نہ تھا کہ اُس کے سر پر کیا گُذری ہے اور کس کے ہاتھ میں گرفتار ہے۔ حسین کی آواز سُن کے اُس نے سر اٹھایا اور پہچانتے ہی چلاّ اُٹھا ''آہا! حسین! مجھے تیری جُستجُو تھی۔ جب قلعہ اَلمُوت سے تیرے نکالے جانے کی خبر معلوم ہوئی تو مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ افسوس! اگر تُو میرے پاس آ جاتا تو اِس طرح ناکام نہ رہتا۔

دراصل علی وجودی یہ نہیں سمجھا تھا کہ حسین اب اس کے عقائد کے خلاف ہے۔ اسے خیال گزرا کہ اب تک یہ میرا مُعتقِد ہے اور اسی وجہ سے مجھے تا تاریوں سے چھُڑا کے بڑی دلیری اور بہادری سے یہاں لایا ہے۔

حسین: (عقیدت کی شان اور عمامے کا سرا چھوڑ کے) مگر آپ کو تو غیب کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ آپ نے سیرِ لاہوتی میں بے شک دریافت کر لیا ہو گا کہ میں کن پہاڑوں اور کن گھاٹیوں میں سر ٹکراتا پھرتا تھا۔

یہ سُن کے علی وجودی نے حسین کو بدگمانی کی نظر سے دیکھا اور کہا ''سیرِ لاہوتی اُسی وقت ہوتی ہے جب انسان توجّہ قلبی سے کام لے۔ دراصل میں نے تیرا حال دریافت کرنے کی جانب کبھی توجّہ نہیں کی تھی۔

حسین: مگر یہ اُمید نہ تھی کہ مجھ سے عقیدت کیش کو آپ بالکل چھوڑ دیں گے۔

علی وجودی: او حسین! یہ فتنہ کیوں کر بپا ہوا؟ یقین ہے کہ تجھے معلوم ہو گا، اس لیے کہ تیرے کہنے سے تاتاریوں نے میری جان چھوڑ دی۔

حسین: آپ کو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو ہر امرِ واقعہ ادنیٰ توجہِ قلبی سے معلوم ہو جاتا ہے۔

علی وجودی: اتنا جاننے پر بھی تو عالمِ ارواح کے رموز سے نا آشنا ہے۔ جن لوگوں کو اِن رُموز میں کمال حاصل ہوتا ہے، انھیں کبھی اپنی خبر نہیں رہتی۔ سنا نہیں:

گہے بر طارمِ اعلےٰ نشینم

گہے بر پُشتِ پائے خود نہ بینم

حسین: رُکن الدین خورشاہ نے مجھے جنت میں بھیجنے سے انکار کیا اور اپنے قلعے سے نکلوا دیا جس کے بعد مایوسی تھی اور عجیب بے کسی کی حالت میں تھا۔ افسوس! اس وقت آپ نے خبر نہ لی۔ مگر معاملہ دگر گوں ہونے والا تھا۔ تقدیر نے مجھے ایک اور شخص سے ملا دیا اور اب اس کی برکت و رہبری سے جنت میں پہنچا اور زمّرد سے ہم کناری نصیب ہوئی۔ افسوس! کہ اب میں آپ کے مریدوں سے نکل گیا اور اُس کے مُریدوں اور مُعتقِدوں میں شامل ہو گیا ہوں۔

علی وجودی: وہ کون شخص ہے؟

حسین: تاتاریوں کا سردار ہلاکو خان۔ اور اس کی شرائط حسب ذیل ہیں۔

علی وجودی نے یہ سُنتے ہی سر سے پاؤں تک کانپ کے حسین کی صورت دیکھی اور پُوچھا "وہ شرائط کیا ہیں؟"

حسین: وہ یہ کہ آپ جیسے جتنے مکّار اور سیہ کار ملاحدہ ملیں، ان کا سر تن سے جُدا کر دوں۔

علی وجودی: (سہم کے) اور ایسے ظالمانہ احکام بجالانے میں تمھیں تامُّل نہیں؟

حسین: بالکل نہیں۔ اِسکا سبق تو آپ ہی سے مل چکا ہے کہ مُرید کو مُرشد کے ہاتھ میں ایک بے جان آلے کی طرح رہنا چاہیے۔ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے اور اس کا باطن میرے مُرشد کے نزدیک بہت ہی اچھا اور خُدا کی درگاہ میں مقبول ہے۔

علی وجودی نے شرما کے اور سر جھکالیا اور کہا "مگر جو کچھ بھی ہو، تمھیں رحم سے کام لینا چاہیے"۔ اِس جواب سے حسین کو بہت غصہ آیا مگر اُس نے ضبط کر کے اپنے تئیں روکا اور کہا "بے شک ظلم خدا کو پسند نہیں ہے اور اسی وجّہ سے امام نجم الدین نیشاپوری کی روح آج تک پکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ میرا خون علی وجودی کی گردن پر ہے۔" یہ سُنتے ہی علی وجودی سر سے پاؤں تک کانپنے لگا اور تھوڑی دیر بعد جب اُس کے دل کو ذرا سکون ہوا تو بولا "مگر میرے تمھارے ساتھ ایسے تعلقات رہ چکے ہیں کہ مجھے تم سے بے رحمی کی اُمید نہیں۔"

حسین: اِمام نجم الدین نیشاپوری سے زیادہ مجھے آپ سے تعلّق نہیں رہا ہے۔ وہ میرے چچا تھے ،اُستاد تھے، مُرشد تھے۔

اب علی وجودی کو خوف نے اُس کے اختیار سے باہر کر دیا۔ وہ ایک دفعہ روتا ہوا حسین کے قدموں پر گرا اور چلّایا "رحم رحم!!"

حسین: ہرگز نہیں۔ ہزارہا پاک اور مُقدّس رُوحیں فریاد کر رہی ہیں جو یقیناً اب تمھاری نظر کے سامنے ہوں گی اور تمھیں چاروں طرف سے دھمکا رہی ہوں گی۔

اور بے شک علی وجودی کی اُس وقت یہی حالت تھی۔ وہ بار بار چاروں طرف گھبرا گھبرا کے دیکھتا تھا اور ہر طرف اُسے کوئی مظلوم تصویر چھُریوں اور خنجروں سے دھمکاتی ہوئی نظر آتی تھی۔ عین اسی

حالت میں جب اس کے چاروں طرف چھُریاں ہی چھُریاں نظر آ رہی تھیں، حسین نے اپنے خنجر کو کمر سے نکالا اور اُس کی آنکھوں کے سامنے کر کے کہا "یہی وہ خنجر ہے جو تم سے ملا تھا۔ اور امام نجم الدین نیشا پوری اور امام نصر الدین احمد کے سینوں میں خاص تمھارے حکم سے اور میرے ہاتھ سے اُتر چکا ہے۔ یہ خنجر آج تک باقی ہے اور صرف اس لیے کے تمھارے سینے میں خاص میرے ہاتھ سے اُتر جائے۔ اِسے اچّھی طرح پہچان لو اور تیار ہو جاؤ کہ انتقام کا وقت آ گیا۔"

علی وجودی: مجھے نہ مارو۔ اب میں کبھی مذہبِ باطنیہ کی طرف داری نہ کروں گا۔"

حسین: مگر تمھارا یہ عہد میرے دامن سے خون کے دھبے نہیں چھُڑا سکتا جو تمھاری سیہ کاریوں سے لگے ہیں۔" یہ کہہ کے حسین نے علی وجودی کو زمین پر گرایا اور اُس کے سینے پر چڑھ کے پھر اس کا خنجر اُسکی آنکھوں کے سامنے پیش کیا اور کہا "یہ دیکھو اور خوب پہچان لو کہ یہ وہی تمھارا خنجر ہے۔"

درحقیقت علی وجودی کی موت بُری موت تھی۔ اُس وقت تمام گناہ طرح طرح کی بھیانک صُورتوں کا جامہ پہن کے اُس کی آنکھوں کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ ہزارہا مظلوم روحوں کو دیکھ رہا تھا جو خنجر دکھا دکھا کے اُسے ڈرا دھمکا رہی تھیں۔ اُس نے گھبرا کے آنکھیں بند کر لیں اور حسین سے کہا "خدا کے لیے چھوڑ دے۔ میری بے کسی پر رحم کھا۔"

حسین: نہیں۔ جس دل میں خود ہی خدا کا خوف اور ترس نہیں، اُس پر ترس کھانا گناہ ہے۔

علی وجودی: تو کم بخت! کہیں جلدی کام تمام کر، تا کہ اِن بلاؤں سے پیچھا چھوٹے جو مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔"

حسین: میں فقط اتنے ہی کے لیے تامل کر رہا ہوں کہ تجھے موت کی نازک اور پُرخطر گھڑی کا

اچّھی طرح مزہ مل جائے تو تیرا کام کروں۔

اب علی وجودی بہت بے تاب تھا، حسین کے نیچے دبا ہوا تھا اور حسین اس کا دیا ہوا خنجر اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کر رہا تھا جس کی ڈراؤنی صورت سے ڈر ڈر کے وہ اپنا سر اِدھر اُدھر ہٹا لیتا تھا ''خدا کے لیے اس چیز کو میرے سامنے سے دور کرو۔''

آخر جب حسین نے دیکھا کہ بڑی دیر ہوگئی ہے اور اب قریب قریب قلعے کی ساری آبادی قتل ہوگئی ہے تو اس نے بھی خنجر بھونک بھونک کے اور آواز دے دے کے علی وجودی کا کام تمام کر دیا۔ اپنے سب سے بڑے بہکانے والے سے وہ انتقام لے کے پھر ہلاکو خان کے قریب گیا۔ اب تاتاریوں کو قتل کرنے کے لیے کوئی شخص نہ ملتا تھا۔ اتنے بڑے قتلِ عام سے اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور مجنون کتّوں یا وحشی درندوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے کہ کوئی ملے تو اُس کو قتل کر کے دل کا بخار نکالیں۔ سوائے چند کم سن اور حسین عورتوں کے جو لونڈیاں بنانے کے لیے بچالی گئی تھیں، قلعے المُوت میں کوئی باقی نہ رہا۔

اب فرماں روائے المُوت رُکن الدین خورشاہ کی جستجو تھی۔ لوگ دیر سے اُسے ڈھونڈ رہے تھے۔ لیکن اُس کا پتا نہ چلتا تھا۔ آخر ایک تاتاری تہ خانے میں گھُس کے اُسے پکڑ لایا۔ جیسے ہی وہ ہلاکو خان کے سامنے لایا گیا اور تاتاری سالار کے آگے سر جھکا کے کھڑا ہوا، حسین نے جھپٹ کے ارادہ کیا کہ اپنے خنجر سے اُس کا کام تمام کر دے۔ مگر ہلاکو خان نے چلّا کے روکا اور کئی مُغلوں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ہلاکو خان: یہ یہاں کا بادشاہ ہے اور بے کسی کی صورت میں پناہ مانگتا ہوا آیا ہے لہٰذا اس کی جان بخشی کرنی چاہیے۔

حسین: حضور! اگر یہ بچ رہا تو دنیا میں بہت بڑا فتنہ رہ جائے گا۔ یہ ساری سازشیں اور تمام خرابیاں اسی کی ذات سے تھیں۔

ہلاکو خان: اب وہ سازش کرنے والے ہی نہیں رہے تو یہ کیا کرے گا۔ سب فریبی تو خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں۔ یہ ایک ناتجربہ کار نوجوان دنیا کو ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

حسین: ایسا نہیں ہے کہ کوئی مُعتقِد نہیں رہا ہو۔ مصر و شام سے لے کر سندھ تک ہر جگہ اس کے مُعتقِد پھیلے ہوئے ہیں۔

ہلاکو خان: میں ان مقامات میں بھی جاؤں گا اور اس کے مُعتقِدین سے دنیا کو خالی کروں گا۔ مگر اس کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ جلا وطن کر دیا جائے۔ (اس کے بعد اس نے خورشاہ کی طرف دیکھ کے کہا) ''بے شک تمھارا فتنہ بہت بڑا ہے۔ مگر اس بے کسانہ اور عاجزانہ خاموشی پر ترس کھا کے تمھاری جان بچائی جاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ حکم دیا جاتا ہے کہ ترکستان میں، جہاں تم کو کوئی مُرید و مُعتقِد نہ مل سکے، اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن بسر کرو۔ یہ جتنی عورتیں یہاں ہیں ان میں سے کوئی تمھیں نہیں دی جائے گی۔ ممکن ہے کہ ان کے ذریعے سے پھر تمھارا فساد دنیا کو فریب دینے لگے۔ ترکستان میں جا کے تمھیں اختیار رہے کہ چاہے کسی تاتاری عورت سے عقد کر لینا۔''

اس حکم کے ساتھ ہی ایک مغلی دستے نے اُسے اپنی حراست میں لے لیا۔ حسین نے اَلمُوت کے تاجدار کو بحرِ خزر کے اُس پار تُرکستان کے کسی گمنام گاؤں میں پہنچا دیا اور یہاں جب قلعہ آدمیوں سے خالی ہو گیا تو تاتاری لُٹیرے دولت لُوٹنے، محلوں کو کھودنے اور آگ لگانے میں مشغول ہو گئے۔ محلوں اور جنت میں ہر جگہ آگ لگا دی گئی۔ وہ قصر اور کوشکیں کھود کے زمین کے برابر کر دی گئیں، جو جنت بنی ہوئی تھیں۔ اب ہر جگہ محض مٹی اور اینٹوں کے ڈھیر رہ گئے تھے۔ تاتاریوں نے

انھیں آناًفاناً ایسا کر دیا کہ نہ کوئی رہنے والا تھا نہ رونے والا۔

حسین اپنے دل کی آگ بُجھا کے اور انتقام لے کے جب زمّرد کے قریب گیا تو وہ نہایت ہی پریشان اور بدحواس تھی۔ وفا کیش معشوقہ کو اس قدر پریشان دیکھ کر اُس نے پوچھا ''زمُّرد، اب پریشانی کس بات کی؟''

زمّرد: (روتی آواز میں) اتنا قتلِ عام، ایسی خون ریزی ہو چکی اور پوچھتے ہو کہ پریشانی کس بات کی ہے؟

حسین: اِن ظالموں کی تباہی پر خوش ہونا چاہیے یا غمگین؟

زمُّرد: تم خوش ہو لو، جس کا دل خدا نے ایسا پتھر کا بنایا ہے۔ ایسا وحشت ناک منظر دیکھنا کبھی میرے خیال میں نہ گُزرا ہو گا۔ میں ایسی حالتوں کو دیکھنے کی عادی نہیں ہوں۔

حسین: خیر، اب بتاؤ، کیا ارادہ ہے؟

شہزادی بلغان خاتون سامنے کھڑی تھی۔ یہ جُملہ سُنتے ہی پاس آئی اور بولی ''ارادہ کیا! اب تم دونوں میرے ساتھ چلو۔ زمّرد کو اپنی بہن سے زیادہ عزیز رکھوں گی اور تم کو بھی کسی بات کی تکلیف نہ ہو گی۔

زمّرد: نہیں شہزادی! ہم دونوں نے بڑے گناہ کیے ہیں۔ حج کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے تھے، تقدیر نے ان مُصیبتوں میں مبتلا کر دیا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ پہلے حج کر لیں تو پھر اور کوئی کام کریں۔ اگر زندگی باقی ہے تو یہ فرض ادا کر کے ہم دونوں وہیں قراقرم میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ میں جب تک خانہ ٔخدا میں اپنے لیے دعائے مغفرت نہ کرلوں گی۔ اس وقت تک یہ ندامت نہ ٹلے گی جو ہر وقت دل میں موجود رہتی ہے۔ کوئی وقت نہیں گُزرتا کہ یہ یاد نہ ستاتی ہو۔

حسین:　بے شک، زمّرد کا کہنا ٹھیک ہے۔ میرا دل ہمیشہ مجھ پر لعنت کرتا ہے۔ شاید وہاں جا کے اور اس مقدس مقام میں دعا کر کے یہ بات دور ہو جائے۔

بلغان خاتون:　کیوں کر کہوں۔ دل تو نہیں چاہتا کہ تم کو جُدا کروں۔ مگر اب تم کو اصرار ہے اور وہاں جانے کو اپنا فرض سمجھتے ہو تو مجھے، تو روکنا　بے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میری ایک بات مان لو۔

زمّرد:　جو حکم ہو! آپ کا ہر حکم بجالانا ہمارا فرض ہے۔

بلغان خاتون:　تم دونوں باہم عقد کرنے کی غرض سے نکلے تھے۔ میں چاہتی ہوں کہ جُدا ہونے سے پہلے تم دونوں کا عقد کر دوں تا کہ وطن جانے سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو جائے کہ تم دونوں میں باہمی اتفاق کی صُورت پیدا ہو گئی ہے اور یہ بات یاد کر کے میں دل خوش کر لیا کروں کہ تمھاری آرزوئیں میرے ہی ہاتھ سے پوری ہوئیں۔

یہ ایسی درخواست نہ تھی جس سے کسی کو انکار ہوتا۔ حسین نے صاف الفاظ میں رضامندی ظاہر کر دی مگر زمّرد مسکرائی اور ایک شرم کی آواز سے سر جُھکا کے بولی ''اب میں آپ کی لونڈی ہوں، اور جو حکم ہو اس سے انکار نہیں کر سکتی۔''

دوسرے دن صبح ہلاکو خان نے فتح کی خوشی میں اور مال تقسیم کرنے کے لیے بڑا بھاری جشن کیا جس کے لیے فوج کے معزّز افسروں کی ایک محفل مرتّب کی گئی۔ گزشتہ فتح پر بڑے جوش و خروش سے اظہارِ مسرت کیا گیا اور اسی کامیابی اور ظفر کی یاد میں بلغان خاتون کی درخواست اور ہلاکو خان کے حکم سے شیخ نصیر الدین طوسی جیسے محقّقِ زمانہ اور علّامہ روزگار نے جن کی تاتاریوں میں بڑی قدر و منزلت تھی اور جو اس موقع پر موجود تھے، حسین اور زمّرد کا نکاح پڑھایا۔

اِس کارروائی کے بعد سب آپس میں رُخصت ہوئے۔ بلغان خاتون نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ قراقرم کا راستہ لیا۔ ہلاکو خان نے اپنی فوجِ ظفر موج کے ساتھ آذربیجان کی طرف کوچ کیا۔ حسین اور زمّرد پھر اُسی شان سے، جس طرح پہلے گھر سے نکلے تھے، ارضِ حجاز کی طرف روانہ ہوئے اور الموُت کے کھنڈروں اور اُن کی تمام لاشوں پر گدھوں اور مُردار خوار طیور کے بڑے بڑے غول چھوڑ دیے۔

زمّرد اور حسین نے مکہ معظّمہ میں پہنچ کر، غلافِ کعبہ پکڑ کے، نہایت ہی رقّتِ قلب اور جوشِ دل سے مغفرت کی دعا مانگی کہ اے اللہ! ہمیں تمام گناہوں سے نجات دے۔ اگرچہ ہم نے تیری نافرمانیاں کیں، تیرے مقبول و بے گناہ بندوں کی جانیں لیں مگر ہم ایک بڑے فریب میں مُبتلا تھے۔ شیطان کا ہم پر اس قدر تصُرف تھا کہ گناہوں کی بُرائیاں نظر نہ آتی تھیں۔ ہم نے گناہ کیے مگر سمجھ کر نہیں، ہمارے قدموں کو لغزشیں ہوئیں مگر ایک بہت بڑے فریب میں مُبتلا ہو کے۔ تُو عالم الغیب ہے۔ دلوں کی باتیں جانتا ہے۔ ہماری بے کسی اور بے بسی کو دیکھ اور ان سخت گناہوں سے درگُذر کر۔ اِس طرح گناہوں کا زنگ دل سے مٹا کے واپس روانہ ہوئے۔ چند روز اپنے شہر آمل میں رہے اور باقی ماندہ زندگی قراقرم میں جا کے شہزادی بلغان خاتون کی صُحبت میں صرف کر دی۔

------☆☆☆------